اقبال شناسی

عالمی تناظر میں

ڈاکٹر شفیق عجمی

اقبال شناسی

عالمی تناظر میں

ڈاکٹر شفیق عجمی

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ISBN - 978-969-8460-20-4

طبع اول	2011
تعداد	500
مصنف	ڈاکٹر شفیق عجمی
سرِ ورق	محمد جاوید

ناشر

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی

70-شاہراہ قائداعظم، لاہور

تقسیم کار

کوآپرا ایک سنٹر اینڈ آرٹ گیلری

70-شاہراہ قائداعظم، لاہور

فون: 042-37321161

042-37322926

طابع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

انتساب

ارمغان ، علی ، نبیہہ

اور

تزئین

کے نام اِس دعا کے ساتھ
خورشید کرے کسبِ ضیا ''اِنکے'' شرر سے

مشرق و مغرب کے وہ تمام اقبال اسکالرز

اس کاوش کے محرک ہیں

جنھوں نے اقبال شناسی کی روایت کو

نئی رفعتوں سے آشنا کیا!

فہرست

ڈاکٹر شفیق عجمی

شاعر کا وژن کاسمیک ہو تو وہ سرحدوں کے اندر محدود نہیں رہ سکتا۔ اس کی بصیرت، اس کی روشنی اور اس کی فکر کی چمک بہت دور دور تک جا پہنچتی ہے۔ جنوری 1901ء کے ''مخزن'' میں شائع ہونے والی نظم 'ہمالہ' کی شعریت سے پورا ہندوستان مسرور ہوا تھا اور 'ترانۂ ہندی' کے رنگ و آہنگ سے پیدا ہونے والی نغمہ ریزی کی لہروں کو بھی سرزمینِ ہند نے محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد آنے والے برسوں میں اقبال کے فکر و فن، فلسفہ اور شعری تشکیلات نے مشرق و مغرب کو متاثر کیا، جس سے اقبال شناسی کا ایک بھرپور دور شروع ہوا تھا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اقبالیات کے فاضل نقاد ڈاکٹر شفیق عجمی نے اقبال شناسی کی اس بڑی روایت کا عالمی تناظر میں اس طور پر جائزہ لیا ہے کہ اقبال پر ہونے والی تحقیق و تنقید کی جہات ہمارے سامنے اُجاگر ہو گئی ہیں۔

اقبال کی عظیم شاعری، فلسفہ و فکر اور دانش کا تجزیہ کرنے والوں میں جدید دنیا کے بڑے بڑے دانش وروں، نقادوں، عالموں اور مفکروں کے نام ملتے ہیں جن میں نکلسن، آربری، بوسانی، شمل، عبدالوہاب عزام، عبدالقادر قراحان، مجتبیٰ مینوی، پری گارینا اور علی شریعتی کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی نقاد ایسا ہو گا کہ جس نے اقبال شناسی کے فروغ میں حصہ نہ لیا ہو۔

ڈاکٹر شفیق عجمی کے اس وقیع علمی کام میں مغرب، عالمِ اسلام، ہندوستان اور پاکستان میں اقبال شناسی کی روایت کا گہری نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اُردو میں پہلی بار اقبال شناسی کی اس بڑی روایت کو متعارف کرایا گیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

اقبال شناسی کا صدقہ جاریہ

ڈاکٹر شفیق عجمی ماہر اقبالیات کی حیثیت سے آپ اپنی پہچان ہیں۔ انہوں نے اقبال سے عقیدت رکھنے والے ایسے مفکروں اور عالموں پر تحقیق کی ہے کہ جو اقبالیات کی مین سٹریم سے کئی مشاہیر کے مقابلے میں ذرا دور رہے ہیں۔ اقبال کے حوالے سے کام کرنے والے مخصوص گروہوں اور لوگوں کے دوایر سے باہر بھی اقبال کے چاہنے والوں کی ایک فوج ظفر موج موجود ہے۔ اس کو منصۂ شہود پر لانا نیکی کا کام ہے۔ اقبال شناسی کی روایت علاقائی بھی ہے اور عالمی بھی۔ ڈاکٹر شفیق عجمی کی نظر دونوں حوالوں پر محیط ہے۔

علامہ محمد اقبال کہ جو خم زلف کمال کے دلدادہ و اسیر تھے انہیں اگر ایک طرف بجا طور پر دلی اور لکھنؤ کی لسانی یا جغرافیائی حد بندیوں سے غرض نہیں تھی تو دوسری طرف وہ نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر کی خاک تک اس قوم کو متحد کرنا چاہتے تھے جو پاسبانِ حرم ہونے کو اپنا سرمایہء افتخار جانتی تھی۔ انہیں اپنے اظہار کے لیے وسیع براعظموں کی ضرورت تھی۔ خیال کی تنگنائے انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان کا فکر شش جہتی حوالوں سے مزین تھا۔ دلی اور لکھنؤ کے دائروں میں بند رہ کر سوچنا کئی دوسرے علاقائی مصنفوں اور شاعروں کا مسلک ہو تو ہو اقبال جیسے عالمی سطح کے شاعر کے لیے ممکن نہ تھا۔ اقبال کی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ان کو ہندوستان کی فضاؤں سے باہر لے جانے کے لیے کافی تھا۔

رینالڈ اے نکلسن کہ جن کا تعلق کیمبرج یونیورسٹی سے تھا انہوں نے اقبال کی مثنوی اسرار خودی کو اس لیے انگریزی میں منتقل کیا کہ اس کتاب کے طبع ہوتے ہی اس کی شہرت فارسی ان ملکی اور غیر ملکی عالموں میں پھیل گئی۔ اس مثنوی میں انسان کے ارتقاع کے تناظر میں ایک ایسے موضوع کو بنیاد بنایا گیا تھا کہ جس کی مثال اس سے قبل لکھی جانے والی عالمی شاعری میں موجود نہ

تھی۔ایک فلسفی شاعر نے کائنات،انسان اور معاشرت کے تناظر میں جس فوق البشر کی حد بندی کی وہ ایسی آزادی کا خواہاں تھا کہ جس میں وہ سر اٹھا کر اپنی خودی کی حفاظت کر سکے۔اقبال چاہتے تھے کہ انسان صرف اور صرف ہستی برتر کے سامنے سر بسجدہ ہو اور دنیاوی بتوں اور حرص و ہوا کو چھوڑ کر عزت و آبرو سے جینا سیکھے۔اس فلسفیانہ نظم نے اقبال کو ان کے معاصر مغرب میں موجود مذہبی وجودیت کے تصورات سے قریب کر دیا تھا۔چنانچہ نکلسن کہ جو خود فارسی اور عربی جاننے والے مستشرق تھے انہوں نے اس مثنوی کے نادر فکری موضوع کو پسند کیا اور اسے مغربی دنیا کے لیے ایک تحفے کے طور پر پیش کیا۔اقبال کا یہ محبت نامہ یوروپی قارئین کو مشرقی شاعری میں موجود بڑے موضوعات کی جانب توجہ دلانے کے لیے کافی تھا۔نکلسن نے مولانا روم کی مثنوی کو بھی انگریزی میں منتقل کیا۔انہوں نے ادبیات عربی کی تاریخ بھی لکھی اور اسلامی تصوف پر بھی ایک مستقل کتاب رقم کی۔اقبال اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ انہیں ایسے بڑے مستشرق کی اعانت ملی۔

علامہ اقبال اپنے مرشد رومی کی مانند ناقہ بے زمام کو سوئے قطار کھینچنے کی بات کر رہے تھے۔اس لیے وہ اپنے ساز سخن کو بہانہ قرار دے رہے تھے اور اپنی نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھنے کی بات کر رہے تھے۔لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انہیں چار دانگ عالم میں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے شہرت ملی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ انہیں اپنی زندگی میں اپنے مشرقی ہونے کی وجہ سے اپنی ناقدری کا احساس بھی کافی پریشان کیا کرتا تھا۔اس حوالے سے ان کی کتاب پیام مشرق کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ جو انہوں نے مشہور جرمن شاعر،ناول نگار اور مفکر کے دیوان مغربی کے جواب میں لکھی ہے۔گلشن ویمر میں خوابیدہ اس شاعر کو علامہ اقبال نے غالب کا ہمنوا بھی قرار دیا ہے لیکن اس میں اور غالب میں انہیں یہ فرق نظر آیا ہے کہ غالب کی قبر اجڑی ہوئی دلی میں موجود ہے،سو اس کی شہرت کی راہ میں اس کی قومیت اور علاقہ حائل ہے۔علامہ اقبال کو اپنے شعری جوہر کے معجزاتی حوالوں کا احساس تھا اور انہیں غالب ہی کی طرح اپنی شاعری کی بلند پروازی کا اندازہ تھا اس لیے انہیں اس امر کا شدید احساس رہا ہے کہ ان کے شعری اور فکری تصورات دنیا بھر کے قارئین تک نہیں پہنچ پائے۔گوئٹے کے مغربی ہونے کی وجہ سے اسے ملنے

والی شہرت کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال کا خیال تھا کہ ان کے اپنے کلام میں جو فکری گہرائی اور موضوعاتی وسعت ہے وہ ان کے ایک غلام قوم کے فرد ہونے کی وجہ سے عالمی پذیرائی سے محروم ہے۔اس ضمن میں اقبال کہتے ہیں:

تا مرا رمز حیات آموختند — آتشے در پیکرم افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام — عشق را عہد شباب آوردہ ام
پیر مغرب شاعر المانوی — آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق — ماہتابے ریختم بر شام شرق
تا شناسائے خودم خودبیں نیم — باتو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جوانان مثل برق — شعلہ من از دم پیران شرق
او چمن زادے چمن پروردۂ — من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن فردوس گوش — من بصحرا چوں جرس کردم خروش
ہردو دانائے ضمیر کائنات — ہردو پیغام حیات اندر ممات
ہردو خنجر صبح خند آئینہ فام — او برہنہ من ہنوز اندر نیام
ہردو گوہر ارجمند و تاب دار — زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید — تا گریبان صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز — در ضمیر بحر نایابم ہنوز
آشنائے من زمن بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہ خسروی اورا دہم — تخت کسری زیر پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد زمن — رنگ و آب شاعری خواہد زمن
کم نظر بیتابی جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرت من عشق را در بر گرفت — صحبت خاشاک و آتش در گرفت
حق رموز ملک و دیں برمن کشود — نقش غیر از پردۂ چشمم ربود

برگ گل رنگیں زمضمون من است — مصرع من قطرۂ خون من است
تانہ پنداری سخن دیوانگیست — در کمال ایں جنوں فرزانگیست
از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند — در دیارِ ہند خوارم کردہ اند
لالہ و گل از نوایم بے نصیب — طائرم در گلستان خود غریب
بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است — وائے برمردے کہ صاحب جوہر است

ترجمہ:

''چونکہ انہوں نے مجھے زندگی کی رمز سکھائی ہے اور میرے پیکر میں آتش بھڑکا دی ہے، میں سینہ روشن کرنے والی نوا لایا ہوں۔

عشق کے لیے عہد شباب لایا ہوں۔ پیر مغرب جرمنی کا شاعر کہ جو پہلوی طور طریقوں کا قتیل ہے اس نے شوخ وشنگ معشوقوں کی نقش بندی کی ہے اور مشرق کو مغرب کا سلام بھیجا ہے۔ میں نے اس کا جواب پیغام شرق کی صورت دیا ہے اور مشرق کی شام پر چاندنی بکھیر دی ہے۔ چونکہ میں اپنا شناسا ہوں، میں تجھے بتاتا ہوں کہ وہ کون تھا اور میں کون ہوں۔ وہ فرنگی جوانوں میں برق کی مثل تھا اور میرا شعلہ مشرقی پیروں کے دم سے ہے۔ وہ باغ میں پیدا ہوا اور باغ میں پلا تھا اور میری نمو مردہ زمین سے ہوئی ہے۔ وہ باغ میں بلبل کی مانند فردوس گوش ہے۔ میں نے صحرا میں جرس کی مثل شور کیا ہے۔ دونوں ہی ضمیر کائنات سے آگاہ ہیں۔ دونوں ہی ممات کے اندر زندگی کا پیغام ہیں۔ دونوں ہی صبح کی مانند مسکراتے آئینے جیسے خنجر ہیں۔ وہ برہنہ ہے اور میں ابھی نیام میں ہوں۔ دونوں ہی وہ تابدار اور مبارک موتی ہیں جو بے کنار سمندر میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ قلزم کی تہ میں یوں شوخ ہوکر تڑپا کہ اس نے سیپی کا گریبان چاک کردیا۔ میں ابھی سیپی کی گود میں چمک رہا ہوں اور ابھی تک سمندر کے اندر گم ہوں۔ میرا آشنا مجھ سے بیگانہ ہو گیا ہے اور میرے شراب خانے سے تشنہ چلا گیا ہے۔ میں اسے شاہ خسرو کا شکوہ دیتا ہوں اور اس کے پاؤں میں کسریٰ کا تخت رکھتا ہوں۔ وہ مجھ سے دلبری کی حکایت چاہتا ہے اور مجھ سے شاعری کا آب و رنگ چاہتا ہے۔ اس کم نظر نے میری جان کی بیتابی نہیں دیکھی۔ اس نے میرا ظاہر تو دیکھا ہے پوشیدہ نہیں

دیکھا۔ میری فطرت نے عشق کو اپنے دامن میں سمویا ہے یعنی خاشاک کی صحبت تھی اور آگ لے لی ہے۔ حق نے مجھ پر ملک و دین کے راز کھولے ہیں۔ اس نے میری آنکھ کے پردے سے غیر کا نقش مٹا دیا ہے۔ میرے مضمون سے پھول کی پتی رنگین ہے۔ میرا مصرع میرے خون کا قطرہ ہے۔ تو یہ خیال نہ کر کہ (میری) شاعری دیوانگی ہے بلکہ اس جنوں کی انتہا میں تو فرزانگی مستور ہے۔ انہوں نے مجھے فن کا سرمایہ دار بنایا ہے اور دیارِ ہند میں خوار کیا ہے۔ میری نوا سے لالہ و گل محروم ہیں۔ میں ایسا پرندہ ہوں جو اپنے گلستان میں اجنبی ہے۔ اکثر و بیشتر کہ آسمان کمینوں اور سفلوں کو پالتا ہے اس لیے اس مرد پر افسوس ہے کہ جو کسی جوہر کا حامل ہے۔"

ڈاکٹر شفیق عجمی نے اقبال شناسی کی مقامی اور عالمی روایت کے پیش نظر اس امر کی نشاندہی کی ہے اب مشرق و مغرب میں اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے معاملات میں حوصلہ افزا پیش رفت ہو چکی ہے۔ ان سے قبل ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال ممدوح عالم کے نام سے جو کتاب شائع کی تھی اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی پذیرائی دنیا کے اکثر بڑے اور چھوٹے ملکوں کے اقبالیات کے ماہروں نے کی ہے۔ انہوں نے ہرمن ہیس کے حوالے سے اقبال کی مغربی فکر سے نسبت کو نمایاں کیا ہے۔ گوئٹے کے بارے میں ہم اقبال کے خیالات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ ہیگل، کارل مارکس، نطشے اور برگساں کے تصورات کو بھی وہ خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ کائنات، انسان، سماج، سیاست، معیشت اور فلسفے کے میدانوں میں ان مفکروں کی مساعی کا اقبال نے جابجا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر شفیق عجمی نے پروفیسر ڈکنسن، ہربرٹ ریڈ اور ای ایم فاسٹر کی اقبال مخالف تحریروں کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے تسلی بخش جواب بھی دیئے جا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے ہندوستان، ایران، ترکی، روس، جرمنی، فرانس، اٹلی، انگلستان، امریکہ، چیکوسلاواکیہ کے عالموں اور محققوں کے اقبال کے حوالے سے لکھے گئے مضامین کی روشنی میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ عالمی سطح پر اقبال فہمی کی روایت خاصی مستحکم رہی ہے۔ لیکن ان دنوں دنیا کی مخصوص فضا میں جس طرح مسلمانوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کے تناظر میں اقبال شناسی کے معاملات بھی متاثر ہوئے ہیں اور جیسی پذیرائی اقبال کی ہوتی رہی ہے اس میں اب فرق آتا جا رہا ہے۔ اس کی شاید ایک وجہ اقبال کی مغربی تہذیب اور سامراج پر شدید تنقید میں

بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جہاد کے ضمن میں اقبال کے تصورات کو مغرب میں مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شفیق عجمی کی رائے بھی ملاحظہ ہو:

''ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد مغربی دانشوروں بالخصوص امریکی پالیسی سازوں نے اسلام کو ایک ممکنہ خطرہ ''ہَوّا'' بنا کر پیش کرنے اور اکیسویں صدی کے آغاز میں سیموئل پی ہنٹنگٹن تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilizations) کی بحث میں اسلام کو مغرب یا تہذیب مغرب کے ایک ممکنہ مدمقابل یا حریف کے طور پر پیش کرنے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ محض آج کے حالات کا کوئی پہلا فوری ردعمل نہیں ہے بلکہ انہی خیالات یا زیادہ صحیح طور پر خدشات کو بیسویں صدی کی دوسری، تیسری دہائیوں میں پروفیسر ڈکنسن اور فاسٹر کی ''اسرار خودی'' پر تنقید میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی نوآبادیات میں ایسی کسی بھی کاوش کو جو فکر و شعور کو اجاگر کرتی اور عمل کی اساس پر زور دیتی ہو، حقیقی معنوں میں برٹش امپریلزم کے لیے خطرہ قرار دینا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا نہ ہی آج کے عہد میں مشکل ہے۔''

ڈاکٹر شفیق عجمی نے پروفیسر اے جے آربری، این ماری شمل، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر علی نہاد تارلان، ایڈورڈ تھامسن، لوئی میسون، ایوامایوچ، لوس، باربرا مٹکاف، ڈاکٹر سخا چوف، ستے پین ینتس، شیلا میکڈونا، کلوڈ میتج، کینٹ ویل سمتھ، گورڈن پولنسکایا، نتالیا پری گارینا، یاں ماریک، ایچ جوڈ، ایڈورڈ میکارتھی، ایل ایس مے، آئین سٹیفن، پروفیسر رش بروک، پروفیسر نارتھ روپ، ڈاکٹر ایڈورڈ ایلسن، ڈاکٹر والٹر، ڈاکٹر ولیم ڈوگلس، رابنسن فرانسس اور وکٹر کیرنن وغیرہ کے مضامین اور کتابوں کے تناظر میں مغربی اور مشرقی قارئین کے سامنے آنے والے اقبال فہمی کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کی تحقیقی بصیرت قابل صد ستائش ہے کہ انہوں نے خودی، قومیت، ملت، مشرق و مغرب، تہذیب و تمدن اور انسانی و گروہی تقسیموں کے پس منظر میں اقبال پر

مذکورہ محققوں اور عالموں کے نظریات کا معروضی جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے کا برملا اظہار کیا ہے کہ:

''اہل مغرب نے افکار اقبال کے غائر اور سنجیدہ مطالعے کے بعد اپنے خیالات کو قلمبند کرتے ہوئے غیر متعصبانہ رویہ اختیار کیا اور اقبال کو مشرق کے باوقار اور قابل ذکر شعرا اور مفکرین میں ایک ممتاز مقام پر فائز کیا، لہٰذا ہم مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کو شاندار قرار دے سکتے ہیں البتہ یہ نا قابل فہم ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے استقبال کو مغربی دنیا میں جو خاص اہمیت دی گئی اور ذرائع ابلاغ نے بیسویں صدی کی achievements کے حوالے سے جو خصوصی تحقیقی سلسلے مرتب کیے ان میں اقبال اور افکار اقبال کو یکسر کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اس ضمن میں ہفت روزہ "TIME" کی مثال دی جا سکتی ہے جس نے ۱۹۹۹ء کے دوران بیسویں صدی کی اہم مشرقی و مغربی شخصیات کے حوالے سے کئی اہم نمبر شائع کیے (۴۹)۔ خاص طور پر "Time Asia" کی ایک اشاعت کا عنوان ہی "The Most Influential Asians of the 20th Century" ہے جس میں برصغیر کی ادبی شخصیات میں سے رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت اور فن پر دو صفحات کا تجزیہ موجود ہے لیکن اقبال کا کچھ تذکرہ نہیں۔ اس کے محرکات پر بحث ہمارا موضوع نہیں لیکن یہ سوال ضرور ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک صدی پر پھیلی ہوئی اقبال شناسی کی روایت، جس میں مغرب کا بھی قابل قدر حصہ ہے کہیں آج بڑھتے ہوئے عالمی تعصبات اور بدلتی ہوئی ترجیحات کا شکار تو نہیں ہو رہی؟''

اقبال نے زندگی کی جو رمزیں سیکھی تھیں وہ مغربی آقاؤں، مشرقی جاگیرداروں، سرمایہ داروں کے وارے میں نہیں آتیں۔ ان کے فکر و خیال کا جو الاؤ ان کی شاعری میں روشن ہوا تھا اسے بجھانے یا اس سے کنی کترانے کی کوششیں جاری ہیں۔ ان کی نوا کو خاموش کرنا اب کسی کے بس میں نہیں ہے کہ ان کی اردو اور فارسی شاعری اور فلسفیانہ تحریروں اور ان کے مختلف زبانوں میں

ترجمے انسان دوست قارئین کے سینے روشن کرتے رہیں گے۔ وہ انسانی ضمیر میں جس قسم کے عشق کو راسخ کرنا چاہتے تھے وہ مغرب کے رومانوی شاعروں کے تصورات سے ماوراشے ہے۔ پیر مغرب کے لیے اس عشق کے عہد شباب کو سمجھنا مشکل تھا کہ وہ تو شوخ و شنگ معشوقوں کی تصویر کشیاں کررہا تھا۔ مغرب کے لیے پیام مشرق اقبال کی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں بھی موجود ہے۔ اس میں انہوں نے حکمت فرعونی کی جگہ حکمت کلیمی کی نقش بندی کی ہے۔ مغرب کے استحصالی نظاموں کا کچا چٹھا کھولا ہے۔ اقبال کا شعلہ پیر رومی کی عطا تھا۔ انہوں نے اپنی مردہ زمین میں وہ تاثیر پیدا کردی ہے کہ اس میں کئی قسم کے باغوں کی نمو کے امکان پیدا ہو گئے ہیں۔ اقبال کی بانگ درا صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی اس نے ضمیرِ کائنات کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ اقبال کی حیات آفریں شاعری زندگی کے تحرک سے معمور ہے۔ ان کے فکر کا خنجر بھی بے نیام ہو چکا ہے۔ ان کا موتی بھی بے کنار سمندر میں موجود سیپی کا گریبان چاک کر کے باہر آ چکا ہے۔ ان کا آشنا پلٹ آیا ہے یعنی وہ ان کے افکار سے بیگانہ نہیں رہا۔ ان کی شاعری ملک و دین کے راز کھول چکی ہے۔ اب ان کے جوہر فن کی قدر ہو رہی ہے اور وہ دیارِ ہند میں خوار نہیں رہے۔ ڈاکٹر شفیق عجمی نے اپنی زیر بحث کتاب میں جو حقائق دیئے ہیں ان سے انداز ہوتا ہے کہ اقبال کی نواؤں سے لالہ وگل بے نصیب نہیں رہے اور نہ ہی وہ ایسے پرندے ہیں کہ جو اپنے گلستان میں اجنبی ہیں۔ ان کے جوہر کی پہچان مقامی اور عالمی دونوں سطحوں پر ہوئی ہے اور مزید حوالوں سے ہوتی رہے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

مقدمہ

اقبال کی فکری وشعری عظمتوں کا اعتراف عالمی سطح پر کیا گیا ہے اور یقیناً اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ اپنے عہد کے مروجہ سانچوں کے برعکس اس کے اشعار آبدار محض سرور و انبساط کا ذریعہ نہیں بنتے اور نہ ہی اس کا فکر و فلسفہ حالتِ نزع طاری کرتا ہے بلکہ وہ ایک محکوم اور منجمد معاشرے کو تحرک، تغیر اور انقلاب سے آشنا کرتا ہے۔ اس سے پہلے بھی شعراء نے جمال و زیبائی کے نغمے اور ترانے بڑے طمطراق اور فنی مہارتوں کے ساتھ گائے تھے؛ فیلسوف اور دانشور بیکار فلسفہ طرازی سے ذوقِ عمل کو موت کی نیند سلانے کا کام لیتے رہے۔ لیکن اقبال نے اپنے افکار سے حالات کو بدلنے کی سعی کی اور ثابت کر دکھایا کہ فلسفی، مفکر اور شاعر کا اصل کام دنیا کو بدلنا اور تبدیلی کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اقبال کے فکر کی تازگی، بلند آہنگی اور انقلابیت سے زمانہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ علمی دنیا میں اس کا خیر مقدم کیا گیا، اس کے فکر و شعر کی تفہیم و تشریح کے عمل کا آغاز ہوا، تراجم ہوئے، ترجمانی کی صورتیں سامنے آئیں، بحث و تنقید کا دروازہ کھلا، اتفاق و اختلاف، رد و قبول، اخذ و اکتساب کے سلسلے بڑھتے چلے گئے اور ایک روایت کا آغاز ہوا جو جلد ہی برصغیر کی جغرافیائی حدود کو پار کر کے چار دانگ عالم میں پھیلی، پروان چڑھی اور مستحکم ہوتی چلی گئی۔ آج اس روایت کو " اقبال شناسی " کا عنوان دیا جاتا ہے جس میں مشرق و مغرب کے نامور محققین، شارحین اور ناقدین کی ایک بڑی تعداد نے اپنے انداز اور اسلوب میں بہت کچھ contribute کیا ہے جس سے اس روایت کو قوت، تحریک اور وسعت حاصل ہوئی ہے۔

زیرِ نظر کاوش ایک صدی سے زائد عرصہ پر محیط اقبال شناسی کی اسی روایت کے ایک اجمالی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اس کے عالمی تناظر کو focus کیا گیا ہے۔ برصغیر کی

حدود سے باہراس کے اہم مراکز مغرب میں انگلستان، جرمنی، فرانس وغیرہ ہیں جبکہ روس (سابقہ سوویت یونین) میں بھی اقبال شناسی کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ عالم اسلام میں مصر، ترکی، افغانستان اور بالخصوص ایران میں اعلیٰ پایہ کا تحقیقی وتشریحی کام ہوا ہے۔ بھارت اور پاکستان میں اقبال شناسی کو موضوع بناتے ہوئے اس کی متنوع جہات اور رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کو باقاعدہ تاریخ کی صورت دینے سے گریز کرتے ہوئے متعلقہ خطوں میں اس روایت کے نمایاں رجحانات، تجزیات اور تراجم وغیرہ پر توجہ کو مرتکز کیا گیا ہے۔ اقبال اور اقبالیات سے متعلق بنیادی مباحث کے بعد مغرب سے آغاز کر کے مسلم دنیا کے بعض اہم ممالک میں اس علمی روایت کے اہم نمائندوں کے کام کا مختصر تعارفی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ روایت متحدہ ہندوستان سے پھوٹی اور پروان چڑھی اور آزادی کے بعد نشیب وفراز سے بھی گزری لہٰذا اس کے بیان میں قدرے تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ بعض اہم اقبال شناسوں جیسے عزیز احمد، خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور دیگر کی اقبالیاتی تحقیقات کا آغاز تقسیم سے پہلے متحدہ ہندوستان سے ہو چکا تھا لیکن آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے آئے لہٰذا ان کا تفصیلی تذکرہ پاکستان میں اقبال شناسی کے تحت ہی کیا گیا ہے۔

پاک وہند کے اہم اقبال دانشوروں کے علاوہ جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا، مغربی مستشرقین میں سے اے آر نکلسن (A.R. Nicholson)، اے جے آربری (A.J. Arberry)، سرہربرٹ ریڈ (Sir Herbert Read)، الیساندرو بوسانی (Alessandro Bausani)، ڈاکٹر این میری شمل (Dr. Annemarie Schimmel)، شیلا میکڈونا (Sheila Mcdonough)، سابقہ سوویت یونین میں سے ایل پولونسکایا (L. Polonskaya)، اے سخاچوف (A. Sukhotchev)، مریتا ستے پین ینٹس (Marietta Stepanyants)، اور نتالیا پری گارینا (Natalia Prigarina)؛ عالم اسلام میں عرب دانشور عبدالوہاب عزام، ڈاکٹر حسین مجیب المصری، سمیر عبدالحمید، شعلان، عبدالمجید خطیب، عباس محمود الاعظمی، عبداللطیف الجوہری، ڈاکٹر عبدالہادی؛ اتاترک کے دیس میں سے محمد عاکف، عبدالقادر قراحان، علی نہاد تارلان؛ ایران میں سید محیط طباطبائی، غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی، احمد علی رجائی، حسین خطیبی اور ڈاکٹر علی شریعتی کے علاوہ قائدین انقلاب ایران بھی اقبال شناسی کی

عالمی روایت میں شامل ہیں جنہوں نے اقبال کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ افکارِ اقبال سے رہنمائی حاصل کیے بغیر ایران میں ہزار سالہ شہنشاہیت سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں تھا اور اسی لیے انہوں نے اقبال کو ''مشرق کا بلند ستارہ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

افکار اقبال کی تفہیم و تشریح اور تحقیق و توضیح کے سلسلے میں مختلف مکاتیب فکر، اداروں اور اہل علم کے کردار کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان تحقیقی نتائج پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے جن سے حقیقی اقبال کی دریافت میں مدد مل سکے اور نوجوان نسل میں اقبال کے حقیقی افکار کی قدر و وقعت کا احساس بھی پیدا ہو اور وہ اقبال کے ورثہ کو عصری تقاضوں کی روشنی میں جانچنے اور آگے بڑھانے کے اہل ثابت ہو سکیں۔

اقبال رسم پرستی کے قائل نہیں تھے لہٰذا آخر میں کچھ مہربان ہستیوں کے خلوص اور تعاون کے اعتراف کو کسی رسم کی بجا آوری ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ رئیس الجامعہ، ڈاکٹر خالد آفتاب کی دانش گاہِ اقبال، جی سی یونیورسٹی میں علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کی تحسین لازم ہے جن کی بدولت قلم اور کتاب کے ساتھ ہمارا تعلق مزید مضبوط اور مستحکم ہوا ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید اقبال کی انسان دوستی کے قائل ہیں اور اقبال دوستوں پر ہمیشہ مائل بہ کرم رہتے ہیں، اس کا ثبوت انہوں نے اس مختصر سی کاوش کے لیے ایک جامع تعارف تحریر کر کے فراہم کیا ہے۔ ان کی ایسی ہی ادائیں اقبالیات کے ساتھ ہمارے شغف کو مہمیز کرتی ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک عالی دماغ محقق، دانشور اور استاد ہیں۔ اس تحریر کے بارے میں ان کی رائے میرے لیے اعزاز کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی عالی ظرفی اور سچی رہنمائی ''کو آپرا'' کی روح رواں مکرمی محمد جاوید جیسی شخصیت سے آشنائی کا ذریعہ بنی اور یوں اس تحریر کو کتاب کی صورت نصیب ہوئی۔ ان تمام اصحاب، رفقائے شعبہ اردو اور دیگر دوستوں کا ہمیشہ ممنون ہوں۔

۱۶ اکتوبر ۲۰۱۰ء

شفیق عجمی

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اردو

جی سی یونیورسٹی لاہور

باب اول

اقبال شناسی کی روایت۔۔۔ایک اجمالی جائزہ

عظمتِ اقبال

اقبال تاریخ فکروادب کی ان چند استثنائی مثالوں میں سے ایک ہیں جن کی زندگی ہی میں ان کے شعری وفکری افکار کو قومی اور عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔

وہ بیسویں صدی کے برصغیر کے ایک عظیم شاعر' مفکر اور مصلح ہیں جنہوں نے اپنے عمیق خیالات اور انقلابی افکار کے اظہار کے لئے بیک وقت اردو' فارسی اور انگریزی زبان کو وسیلہء اظہار بنایا۔ ان کی شاعری اردو اور فارسی میں جبکہ خطبات اور مقالات انگریزی میں موجود ہیں۔ انہوں نے مکاتیب عام طور پر اردو زبان میں لکھے۔

ایک وژنری (Visionary) کی حیثیت سے انہوں نے جو کچھ بھی لکھا' جو کچھ بھی کہا' اس کا مقصد رہبری' رہنمائی اور پیغامبری ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے شعر وحکمت کی روح یہی ہے کہ ایک محکوم مسلم معاشرے کو آمادۂ عمل کر کے کارزارِ حیات میں اپنا فعال کردار ادا کرنے کے لئے تیار کیا جا سکے۔ اقبال نے اپنی تمام حیثیتوں میں اسی ایک مقصد کے حصول کے لئے تاعمر جدوجہد بھی کی ہے اور جدوجہد کا درس بھی دیا ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا فکر وفلسفہ محض کوئی شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ تصور نہیں بلکہ ایک واضح حکمت عملی کا درجہ رکھتا ہے جس کی تصدیق ان کے اپنے فرمان سے ہوتی ہے:

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے (۱)

یہ درست ہے کہ ایک طرف اگر اقبال کے مابعدالطبیعیاتی افکار سے دلچسپی رکھنے والوں کی کمی نہیں تو دوسری جانب جدید علوم کے حوالے سے فکر اقبال کی تفہیم کی کئی کوششیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ اقبال کی تحسین میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ان کے فکری تضادات کی نشاندہی

بھی کی گئی ہے۔ یہ سب کچھ مل کر اقبال کو عظیم بناتا ہے۔ (۲)

اور اس عظمت کے حصول کے لئے اقبال کو فکر وفن کے کڑے معیاروں سے گزرنا پڑا ہے۔ ان کا عہد آج کی طرح قحط الرجال کا شکار نہیں تھا۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر نظر ڈالیں تو ادب و سیاست، فلسفہ و سائنس اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں نادرۂ روزگار ہستیاں مقامات بلند پر فائز نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس عہد کا تجزیہ کیا ہے:

> ''برصغیر میں محمد علی جناح، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پنڈت جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسن نظامی اور علامہ نیاز فتح پوری، سبھی تقریباً اقبال کے ہم عمر و ہم عصر ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اپنے شعبہ ہائے فکر وفن میں منفرد حیثیتوں کے مالک نہ تھے''۔ (۳)

اُس عہد کا عالمی منظر بھی شہرہ آفاق شخصیات سے معمور ہے۔ مفکروں اور مؤرخوں میں سے ہنری برگساں، برٹرینڈ رسل، تھامس آرنلڈ، ٹائن بی، کارل مارکس، لینن کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سیاسی شخصیات میں چرچل، مسولینی، رضا شاہ پہلوی، مصطفیٰ کمال پاشا اور اسٹالن موجود ہیں۔ تخلیقی ادیبوں میں جارج برنارڈ شا اور سمرسٹ مام اور سائنس دانوں میں آئن سٹائن خاص اقبال کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں (۴)۔

دنیائے علم و ادب، فلسفہ و سائنس اور تاریخ و سیاست کی ان نامور شخصیات کی موجودگی میں اقبال ایک ایسی منفرد حیثیت حاصل کرتے ہیں کہ مشرق و مغرب ان کی عظمت کے اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

عظمت کا اعتراف محض کسی رسم کی بجا آوری کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ ایسا ٹھوس علمی

تحقیق کی صورت میں اہل نظر کے سامنے آیا ہے۔ پاک و ہند کے بیسیوں معروف دانشوروں کے علاوہ، جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا، مغربی مستشرقین میں سے پروفیسر اے۔ آر نکلسن، پروفیسر اے۔ جے آربری، ای۔ ایم فاسٹر، ہربرٹ ریڈ، ڈاکٹر این میری شمل، ایساندرو بوسانی، ڈاکٹر شیلا میکڈونف، پولونسکایا، ستے پین ینتس، عالم اسلام میں عرب مفکرین، عبدالوہاب عزام، ڈاکٹر حسین مجیب المصری، سمیر عبدالحمید، شعلان، عبدالمجید خطیب، عباس محمود، حسن الاعظمی، عبداللطیف الجوہری، ڈاکٹر عبدالہادی، ترکی میں محمد عاکف، عبدالقادر قرہ خان، حسین حاتمی، ایران میں سید محیط طباطبائی، غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر احمد علی رجائی، ڈاکٹر حسین خطیبی اور ڈاکٹر علی شریعتی کے علاوہ قائدین انقلاب ایران بھی اقبال شناسی کی عالمی روایت میں شامل ہیں جنہوں نے اقبال کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ افکار اقبال سے رہنمائی حاصل کئے بغیر ایران میں ہزار سالہ شہنشاہیت سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے اقبال کو ''مشرق کا بلند ستارہ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے[۵]۔

اس طرح سے اقبال شناسی برصغیر کی حدود عبور کر کے ایک ایسی عالمی روایت کا درجہ اختیار کر چکی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی رفعتوں اور نئی وسعتوں کو چھو رہی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اگر اقبال کو ''ممدوح عالم'' قرار دیتے ہیں تو اس کی وجہ بھی ان کے نزدیک یہی ہے کہ:

> ''آج کی تمام مہذب دنیا اقبال کے نام اور افکار سے واقفیت رکھتی ہے''[۶]۔

اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مختلف ممالک میں اقبال شناسی کے آغاز اور پھر ایک باضابطہ فکری روایت بننے کا باعث محض سرکاری سرپرستی کو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نکلسن، آربری، این میری شمل، بوسانی، نتالیا پری گارینا اور دوسرے عالمی سطح کے سکالرز سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی سرکاری مشن کی بدولت افکار اقبال کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔ بین الاقوامی سطح پر اقبال کی تحسین کا باعث خارجی عوامل کے برعکس خود

علامہ کے کلام میں تلاش کرنا زیادہ سودمند ہوگا کہ اسی نے ناقدین کو متاثر کیا(۷)۔

اقبال اکادمی پاکستان

یہ کہنا درست ہوگا کہ وفاقی سطح پر قائم ''اقبال اکادمی پاکستان'' جس کا دفتر اور لائبریری ایوان اقبال' لاہور میں موجود ہے' اپنے اردو/ انگریزی سہ ماہی مجلات ''اقبالیات'' اور "Iqbal Review" اور دوسری علمی وادبی سرگرمیوں کے ذریعے افکار اقبال کی ترویج واشاعت میں اپنا فعال کردار ادا کر رہی ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان کو ایک نیم سرکاری ادارے کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں کراچی میں قائم کیا گیا۔ اس وقت کراچی' پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ ۱۹۶۲ء میں ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے اسے از سر نو منظم کیا گیا۔ یاد رہے کہ اقبال اکادمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر ممتاز سکالر ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) تھے۔ وہ ۱۹۵۳ء سے اپنی ریٹائرمنٹ ۱۹۶۵ء تک اکادمی کے ڈائریکٹر رہے۔ ان کے بعد بشیر احمد ڈار' ڈاکٹر عبدالرب' عبدالحمید کمالی' ڈاکٹر ایم معزالدین' ڈاکٹر وحید قریشی' پروفیسر محمد منور' پروفیسر شہرت بخاری اس عہدے پر فائز رہے۔ آج کل محمد سہیل عمر' ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔

اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۵ء میں کراچی سے لاہور منتقل ہوگئی جہاں اکادمی نے اقبال کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں ہنگامی بنیادوں پر کام کیا۔ اقبال کی شخصیت اور فن پر ملک کے معروف اسکالرز سے کتابیں لکھوا کر شائع کی گئیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور اب تک اکادمی کی جانب سے تصانیف اقبال کے علاوہ' اقبال کی حیات اور فکر وفن پر ۱۲۳ (اردو) اور ۵۷ (انگریزی) کتب شائع ہو چکی ہیں (۸)۔

اقبال کے صد سالہ جشن کے حوالے سے اقبال اکادمی کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مقالہ نگار پروفیسر فضل حق فاروقی نے لکھا کہ ایک سال سے بھی کم عرصہ میں اکادمی نے ساٹھ ہزار سے زائد کتب شائع کیں (۹)۔ جس سے یہ التباس ہوتا ہے کہ اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں (Titles) کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے' جبکہ یہ تعداد شائع ہونے

والی کتابوں کی کل کاپیوں کی ہے۔

اکادمی کی اہم اردو مطبوعات میں:۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (سرگزشت اقبال)، سید نذیر نیازی (اقبال کے حضور)، پروفیسر محمد منور (میزان اقبال، برہان اقبال، ایقانِ اقبال، قرطاس اقبال)، ڈاکٹر وزیر آغا (تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں)، ڈاکٹر سلطان محمود حسین (اقبال کی ابتدائی زندگی)، ڈاکٹر نعیم احمد (اقبال کا تصور بقائے دوام)، ڈاکٹر عبدالشکور احسن (اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ)، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ)، محمد سہیل عمر (خطبات اقبال نئے تناظر میں)، ڈاکٹر عبدالمغنی (اقبال کا نظام فن، اقبال اور عالمی ادب)، ڈاکٹر صدیق جاوید (فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ)، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (اقبال اور قرآن)، محمد جہانگیر عالم (اقبال کے خطوط جناح کے نام)، اکرام چغتائی، مرتبہ (اقبال اور گوئٹے) اور ڈاکٹر وحید عشرت (تجدید فکریات اسلام) ہیں۔

اور اہم انگریزی کتب میں:

پروفیسر ایس۔ جی عباس (Dr. Muhammad Iqbal- The Humanist)، وکٹر کرنن (Poems from Iqbal) اقبال کی نظموں کے انگریزی تراجم، جمیلہ خاتون (The Place of God, Man and Universe in the Philosophical System of Iqbal)، پروفیسر محمد منور (Demensions of Iqbal)، پروفیسر نیاز عرفان (Iqbal & Existentialism and other Articles)، ڈاکٹر خورشید انور (The Epistemology of Iqbal)، ڈاکٹر این میری شمل (Gabriel's Wing)، اکرام چغتائی (مرتبہ) (Iqbal and Goethe) اور ڈاکٹر محمد معروف کی Iqbal and his Contemporary Western Thought) شامل ہیں۔

سہ ماہی مجلات ''اقبالیات'' اور ''اقبال ریویو'' اپنے اجراء (۱۹۶۰ء) سے افکار اقبال اور اس سے متعلقہ موضوعات کے علاوہ ادب، فلسفہ، مذہب، الٰہیات کے موضوعات پر مقالات شائع

کرر ہے ہیں۔ دیگر سمعی بصری اعانات (دستاویزی فلمیں' آڈیو/ وڈیو، سی ڈیز) ذرائع سے بھی افکار اقبال کی تشہیر کا کام لیا جارہا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے اسکالرز کے لیکچرز' مختلف نمائشوں اور کلام اقبال کی تفہیم کے لئے فارسی کلاسوں کا اہتمام' افکار اقبال کے فروغ کے لئے کئے جانے والے اکادمی کے نمایاں اقدامات ہیں۔

صدارتی اقبال ایوارڈز کا اجراء

۱۹۸۱ء میں ایک صدارتی حکم نامے کے ذریعے قومی اور بین الاقوامی سطح پر صدارتی اقبال ایوارڈز کے اجراء کی منظوری دی گئی جس کے مطابق اردو اور انگریزی میں اقبالیات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر گولڈ میڈل کے ساتھ پچاس ہزار روپے کی نقد رقم بھی دی جایا کرے گی۔ جبکہ پاکستانی علاقائی زبانوں' پنجابی' سندھی' پشتو' بلوچی' براہوی اور سرائیکی میں لکھی جانے والی چھ بہترین کتابوں پر بھی گولڈ میڈل کے ساتھ تیس ہزار روپے کی نقد رقم اسکالرز کو دینے کا اعلان کیا گیا۔

اب تک بین الاقوامی صدارتی اقبال ایوارڈ حاصل کرنے والی شخصیت معروف جرمن مستشرق اور اقبال شناس ڈاکٹر این میری شمل کی ہے' جن کی معرکتہ الآرا تصنیف (Gabriel's Wing) کو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۱ء کے دوران غیر ملکی زبان میں اقبال پر لکھی جانے والی بہترین تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شمل کو یہ ایوارڈ ۱۹۸۴ء میں دیا گیا۔

قومی صدارتی اقبال ایوارڈ حاصل کرنے والے اقبال شناس درج ذیل ہیں:۔

۱۔ حمید نسیم (مرحوم) کو ان کی کتاب (اقبال۔ ہمارے عظیم شاعر) پر ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۳ء (اردو) پر قومی صدارتی اقبال ایوارڈ دیا گیا۔

۲۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی پنجابی تصنیف ''خودی تے بے خودی'' ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۴ء (پنجابی) کی بہترین کتاب قرار پائی۔

۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیف ''اساسیات اقبال'' کو ۱۹۹۴ء۔ ۱۹۹۶ء (اردو) کے

صدارتی ایوارڈ کا حقدار قرار دیا گیا۔

۴۔ ڈاکٹر خالد مسعود کوان کی انگریزی تصنیف "Iqbal's Reconstruction of Ijtehad" ۱۹۹۴ء۔۱۹۹۶ء (انگریزی) کا ایوارڈ عطا کیا گیا۔

۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب ''اقبال۔چند نئے مباحث'' کو ۱۹۹۷ء۔۱۹۹۹ء (اردو) ایوارڈ دیا گیا۔

۶۔ محمد اکرام چغتائی کی انگریزی کتاب "Goethe, Iqbal and the Orient" پر ۱۹۹۷۔۱۹۹۹ء کا ایوارڈ دیا گیا۔

حکومتی سطح پر ان ایوارڈز کے اجراء کا ایک مقصد جہاں افکار اقبال کی ترقی و ترویج ہے وہیں اس اقدام سے اقبال شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے والے اسکالرز کی تحقیقی کاوشوں کو قومی سطح پر تسلیم کئے جانے کے عزم کا اظہار بھی ہوتا ہے[۱۰]۔

بزمِ اقبال، لاہور

''بزم اقبال'' کے ایک سابق ڈائریکٹر، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ''بزم اقبال'' کے قیام کے تصور سے لے کر اس کے حقیقت بننے تک کے مختلف مراحل اور اس ضمن میں مختلف شخصیات کی خدمات اور بزم کی اب تک کی کارکردگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[۱۱]، جس کے مطابق اقبال کی زندگی ہی میں جب ۱۹۳۲ء میں یوم اقبال منایا گیا تو ''نیرنگ خیال'' نے اقبال پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں دوسرے مضامین کے علاوہ ایک مضمون مولانا راغب احسن کا بھی تھا جس میں پہلی بار اقبال اکیڈمی کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی جس پر پیش رفت ۲۵ مئی ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب اس کی تاسیس کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا جس کا پہلا اجلاس جناب شیخ نسیم حسن، مشیر تعلیم و بحالیات، حکومت پنجاب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اراکین کی حیثیت سے:۔

۱۔ جسٹس ایس۔اے رحمٰن (جج پنجاب ہائی کورٹ)

۲۔ جناب ایس۔ایم شریف (ڈائریکٹر تعلیمات عامہ ا)

۳۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ)

۴۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور)

۵۔ خان بہادر محمد حسین

۶۔ سید نذیر نیازی

۷۔ ڈاکٹر محمد جہانگیر خان (ڈائریکٹر تعلیمات عامہ اا)

شریک ہوئے۔ اور حکومت پنجاب کی ابتدائی گرانٹ ایک لاکھ روپے سے یہ ادارہ وجود میں آیا اور اس کو ''اقبال اکیڈمی'' کا نام دیا گیا لیکن ایک سال بعد اس نام کو تبدیل کر کے ''بزم اقبال'' کا نام دینا پڑا کہ اس عرصے میں پاکستان کی مجلس دستور ساز نے وفاقی حکومت کے زیر اہتمام اقبال اکیڈمی کے قیام کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا تفصیلی تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔

''بزم اقبال'' کے مقاصد کا تعین کرتے ہوئے واضح کیا گیا کہ علامہ اقبال کے فلسفے اور پیغام اور جن موضوعات سے ان کی دلچسپی تھی' بزم اقبال ان پر تحقیق وتصنیف کی حوصلہ افزائی کرے گی اور اقبال کی فکر ونظر اور متعلقہ موضوعات پر کتابیں شائع کرے گی۔

''بزم اقبال'' کے قیام کے ساتھ ہی ایک سہ ماہی مجلّہ (اردو/ انگریزی) شائع کرنے کا فیصلہ بھی ہوا تھا چنانچہ پروفیسر ایم۔ایم شریف (پرنسپل اسلامیہ کالج' لاہور) کی ادارت میں مجلّہ ''اقبال'' کا پہلا شمارہ انگریزی میں جولائی ۱۹۵۲ء میں اور اردو شمارہ اردو میں اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔

۱۹۸۸ء کے بعد مجلّہ ''اقبال'' اردو انگریزی میں یکجا صورت میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں اشاعت کے پچاس سال پورے ہونے پر اس کا ایک خصوصی شمارہ' پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی ادارت میں شائع کیا گیا جس میں پچاس سالہ اردو/ انگریزی مضامین کا انتخاب بھی شامل ہے۔

''بزم اقبال'' نے اقبالیات کے مختلف موضوعات پر اب تک اردو کی تقریباً 115 اور انگریزی کی 30 سے زائد مطبوعات کے علاوہ کچھ کتابیں پنجابی زبان میں بھی شائع کی ہیں۔

اقبال اکادمی پاکستان اور بزم اقبال کے علاوہ بعض دوسرے سرکاری/ نیم سرکاری علمی اداروں نے بھی اقبال اور فکر اقبال کے حوالے سے چند اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ جیسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے "Reconstruction of Religious Thought in Islam"، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کی جانب سے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی ''حکمت اقبال'' (دوسری بار) شائع کی گئی ہے۔ اکادمی ادبیات، اسلام آباد کی طرف سے سال ۲۰۰۲ء کے موقع پر ''اقبال کے سو سال'' کے عنوان سے منتخب مضامین کا مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔

اقبالیات۔ ایک شعبہء علم

آج اقبالیات کو ایک باقاعدہ شعبہء علم کی صورت حاصل ہو چکی ہے۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر بھی اقبال کی زندگی، ان کی شاعری اور فکر پر مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور تحقیق کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب تک ہونے والے کام پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ''اقبالیاتی ذخیرے'' کو دیکھ کر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ اردو کے کسی شاعر یا نثار کی تخلیقات پر اس درجہ ہونے والے کام کی مثال اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔

پاکستان کی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں کے علاوہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بہار یونیورسٹی (بھارت)، ڈرہم یونیورسٹی (انگلستان)، تہران یونیورسٹی (ایران)، عین الشمس یونیورسٹی، قاہرہ (مصر)، چارلز یونیورسٹی، پراگ (چیکوسلواکیہ) میں اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور چیک زبانوں میں پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالات تحریر کئے گئے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی زبان میں لکھے گئے مقالات کی تفاصیل بھی منظر پر آئی ہیں۔ یہ ڈگریاں اردو اور فارسی شعبوں کے علاوہ عربی، فلسفہ اور سیاسیات کے شعبوں میں عطا کی گئیں۔ مختلف جامعات میں ایم۔ اے کی سطح پر لکھے جانے والے مقالات بے شمار ہیں جبکہ ایم۔ فل کی سطح پر بھی کام جاری ہے اور اقبالیات کے موضوع پر اب تک سینکڑوں مقالات قلمبند کئے جا چکے ہیں [۱۲]۔

پاکستان کی مختلف جامعات میں اقبالیات کے باقاعدہ شعبے قائم ہیں جبکہ ۱۹۷۴ء میں اسلام آباد میں فاصلاتی تعلیم کے لئے قائم ہونے والی یونیورسٹی کو اقبال کی ولادت کے جشن صد سالہ کی مناسبت سے ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا نام دے دیا گیا جس میں دوسرے شعبوں کے علاوہ ۱۹۸۱ء سے شعبہء اقبالیات بھی افکار اقبال کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔

پاکستان میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ جہاں ''اقبالیات کو ایک باقاعدہ مضمون کے طور پر اعلیٰ ثانوی سطح سے لے کر ایم۔فل کی سطح تک پڑھایا جارہا ہے''[۱۳]۔اب اس کو پی ایچ۔ڈی کی سطح تک وسعت دے دی گئی ہے اور متعدد سکالرز کو پی ایچ۔ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالات کی تکمیل پر ڈگریاں دی جا چکی ہیں اور بیشتر مقالات زیرِ تکمیل ہیں۔

اقبال' اقبالیات اور اقبال شناسی

افکار اقبال کے حوالے سے تحقیق وجستجو کا یہ سلسلہ اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا جس کی تحقیقی پرکھ کی پہلی کوشش قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کو قرار دیا جا سکتا ہے[۱۲]۔ یہ جائزہ اقبال کی وفات کے سترہ برس بعد مرتب ہوا جبکہ پاکستان کے علاوہ بیرونی دنیا میں بھی اقبال پر تصنیف وتالیف کا آغاز ہو چکا تھا' اور اس سرمائے میں جسے مولف نے ''اقبالیات'' کا نام دیا ہے' وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے[۱۴]۔

قاضی مرحوم نے نہ صرف اس تالیف میں اقبال کی شعری' فکری' سیاسی اور ملی حیثیت کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے بلکہ پہلی بار اقبالیات' اقبال شناسی اور اقبال شناس جیسی اصطلاحات کی وضاحت کی کوشش بھی کی ہے' جو کہ بلاشبہ اس وقت ایک اہم کام تھا۔

قاضی اختر کے نزدیک ''اقبالیات'' کی اصطلاح سے مراد وہ تمام تحریریں اور تقریریں' نظم ونثر' خواہ وہ کسی زبان میں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ یا روایتی صورت میں اقبال کی زندگی' ان کی شخصیت' ان کے علمی وفنی کمالات کے کسی پہلو اور کسی حیثیت سے نزدیک و دور کا تعلق رکھتی ہوں

اقبالیات میں شمار ہوتی ہیں (۱۵)۔

اقبالیات میں شامل علمی ذخیرے کی ترتیب میں سب سے پہلے خود اقبال کی شعری و فکری تصانیف کو رکھا جانا چاہیے' جس کا کہ احساس خود مولف کو بھی ہے اور اس کا اظہار بھی انہوں نے کیا ہے:

''اسی طرح خود علامہ اقبال کی اپنی تحریروں' تقریروں' مکاتیب' تصانیف' اردو' فارسی' انگریزی وغیرہ بھی اس ضمن میں آجاتی ہیں''(۱۶)۔

لیکن آگے چل کر اقبالیات میں شامل تین قسم کی تحریرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ تصانیف اقبال کو پھر فراموش کر دیتے ہیں اور کافی طویل بحث کے بعد ان کو خیال آتا ہے کہ اقبالیات کے سلسلہ میں سب سے پہلے خود اقبال کی تصانیف کا نمبر آتا ہے (۱۷)۔

''اقبالیات'' کی اصطلاح کی جامعیت سے متعلق ان کا یہ دعویٰ یا بیان درست ہے کہ حیات و افکار اقبال کے حوالے سے لکھی جانے والی ایسی تمام موافق اور مخالف' عقید تمندانہ اور ناقدانہ' تنقیدی اور تعریفی تحریریں جو پاکستان میں یا پاکستان کے علاوہ کہیں بھی اور کسی بھی زبان میں لکھی گئی ہوں کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بامعنی بھی ہے' سریع الفہم بھی اور سہل الحصول بھی (۱۸)۔

البتہ ''اقبالیات'' اور ''اقبال شناسی'' کی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو کہ بنیادی طور پر ان دونوں اصطلاحات کے اندر موجود ہے۔ ''اقبالیات'' ایک شعبۂ علم بھی ہے' جس طرح سے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جس میں اولاً اقبال کی شعری و فکری تصانیف اور مقالات و مکاتیب و بیانات شامل ہیں اور ثانیاً ایسی تمام تحریرات و تحقیقات جو حیات و تصانیف اقبال کے تشریحی و توضیحی اور تنقیدی مطالعات پر مبنی ہیں۔ جبکہ اقبال شناسی وہ علمی روایت ہے جس کی بنیاد حیات و افکار اقبال کی تفہیم کے سلسلہ میں کی جانے والی ابتک کی کاوشوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اقبال شناسی کی روایت سے وابستہ اہل علم

کو اقبال شناس؛ اقبال سکالر یا ماہر اقبالیات کہا جائے گا۔ قاضی مرحوم ایسے اصحاب کے لئے ''اقبالین'' کی اصطلاح کو موزوں سمجھتے ہیں جنہوں نے اقبالیات کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے اور ان پر مستقل کتابیں اور مضامین لکھے ہیں [۱۹]۔ وہ ان کے لئے اقبال شناس کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں اور شیخ عبدالقادر؛ عطیہ فیضی؛ چودھری محمد حسین؛ ڈاکٹر یوسف حسین خان؛ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی؛ خواجہ غلام السیدین؛ مولانا اسلم جیراج پوری؛ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم؛ سید نذیر نیازی؛ ممتاز حسن؛ حفیظ ہوشیار پوری؛ سید عبدالواحد؛ ڈاکٹر عشرت حسن انور؛ ڈاکٹر میر ولی الدین؛ میر حسن الدین اور ڈاکٹر سید عبداللہ کو اقبالین کی فہرست میں جگہ دیتے ہیں [۲۰]۔

''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کی تالیف کے وقت ڈاکٹر محمد رفیع الدین؛ اقبال اکادمی پاکستان؛ کراچی کے پہلے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی منصبی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے؛ لیکن مؤلف کی تحقیقی دیانت کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے اقبال شناسوں کی اس فہرست میں انہیں جگہ نہیں دی کیونکہ اس وقت تک اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین کا کام منظر پر نہیں آیا تھا البتہ فلسفہء خودی پر ان کے مضمون بعنوان "Iqbal's idea of the self" مطبوعہ (مجلہ اقبال؛ جنوری ۱۹۵۳ء) کو انہوں نے بہترین ضرور قرار دیا ہے [۲۱]۔

اب جبکہ اقبال شناسی ایک عالمی روایت کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور قومی اور بین الاقوامی سطح کے بیسیوں اسکالرز اس روایت کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشیں اقبال شناسی کی روایت کی وسعت کا ذریعہ بن رہی ہیں؛ اس وسیع علمی روایت کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کے لئے اس کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

۱۔ مغرب میں اقبال شناسی

۲۔ عالم اسلام میں اقبال شناسی (پاکستان کیلئے الگ تفصیلی باب وقف کیا گیا ہے)

۳۔ بھارت میں اقبال شناسی

۴۔ پاکستان میں اقبال شناسی

حواشی وحوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال،کلیات اقبال (اردو) ضرب کلیم اقبال اکادمی پاکستان، لاہور (عوامی ایڈیشن) ۱۹۹۴ء کلیم ۵۵۵/۵۵۔

۲۔ راقم کا مضمون ''تحقیق اور اقبالیاتی تحقیق'' مشمولہ ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی، نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۔

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لئے، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۵۰۷۔

۴۔ اقبال سب کے لئے۔ص ۵۰۸

۵۔ دیکھیے حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی تقریر کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر سید محمد اکرم، دفتر ثقافتی نمائندہ اسلامی جمہوریہ ایران، نومبر ۱۹۹۹ء، ص ۵۴۔

۶۔ تفصیلی بحث کے لئے دیکھیے، ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتبہ، اقبال۔ ممدوح عالم، بزم اقبال، لاہور، نومبر ۱۹۷۸ء، ص ۴۹۔

۷۔ ایضاً، ص ۴۹، ۵۰، ۷۳۔

۸۔ کتابوں کی تعداد، اقبال اکادمی پاکستان کی شائع کردہ فہرست مطبوعات ۲۰۰۴ کے مطابق ہے۔فہرست میں انگریزی کتب نمبر شمار کے تحت درج کی گئی ہیں جبکہ اردو کتب کے لئے یہ اہتمام ضروری نہیں سمجھا گیا۔ وگرنہ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شائع ہونے والی کتب کی تعداد ایک نظر میں معلوم کی جاسکتی ہے۔

۹۔ پروفیسر فضل حق فاروقی کا غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، بعنوان ''مجلہ اقبالیات کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، سال ۲۰۰۰ مخزونہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لائبریری، اسلام آباد مذکورہ عبارت کے لئے دیکھیے ص ۲۔

۱۰۔ اقبال اکادمی پاکستان اور اس کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اردو/انگریزی کتب، اس کے مجلات، اقبالیات اور اقبال ریویو، اور قومی صدارتی اقبال ایوارڈز کی تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل کتب و مقالات، تعارفی کتابچوں اور اشاریوں سے مدد لی گئی ہے۔

(ا۔ اقبال اکادمی پاکستان کا شائع کردہ تعارفی کتابچہ۔ تاریخ اشاعت درج نہیں۔

ب۔قومی صدارتی اقبال ایوارڈ،تعارف اور تفصیل پر مبنی کتابچہ،شائع کردہ،اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

ج۔فہرست مطبوعات ۲۰۰۴ءاقبال اکادمی پاکستان لاہور۔

د۔اختر النساء کا مرتبہ ''اشاریہ اقبالیات'' (اردو،انگریزی،فارسی،عربی،ترکی)۱۹۶۰ء۔۱۹۹۴ءشائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور،۱۹۹۸ء)

۱۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا یہ مضمون ''بزم اقبال۔ایک تعارف'' کے عنوان سے بزم کے سہ ماہی مجلے ''اقبال'' کے اکتوبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔دیکھیے ص ۸۹۔مذکورہ مضمون بعد میں اسی عنوان سے شائع ہونے والی ان کی کتاب کا حصہ بنا۔

۱۲۔ مختلف جامعات میں،اقبالیات کے حوالے سے ہونے والے مختلف سطح کے تحقیقی کاموں کی تفصیلات، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی مرتب کردہ مندرجہ ذیل کتابوں میں موجود ہے:

ا۔جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور،۱۹۷۰ء۔

ب۔جہانِ اقبال،اقبال اکادمی پاکستان لاہور،۱۹۹۷ء۔

۱۳۔ شاہد اقبال کامران،اقبالیات درسی کتب میں،انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،اسلام آباد،۱۹۹۳ء،ص ۱۲۸۔

۱۴۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی تالیف ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' پہلی بار اقبال اکادمی پاکستان، کراچی کی طرف سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی جبکہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں مولف کی وفات کے بعد بغیر کسی ترمیم واضافے کے شائع ہوا۔البتہ ادارے کی طرف سے یہ وضاحت کی گئی کہ پہلی طباعت کی غلطیوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ہمارے پیش نظر یہی دوسرا ایڈیشن ہے۔

۱۵۔ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ،ص ۲۔ ۱۶۔ ایضاً ص ۲۔

۱۷۔ دیکھیے ص ۱۴۔ ۱۸۔ ایضاً ص ۲،۳ ۱۹۔ ایضاً ص ۱۰

۲۰۔ ایضاً ص ۱۰،۱۱،۱۲ ۲۱۔ ایضاً ص ۱۲۹

اہم مغربی ممالک میں اقبال شناسی

نوبل انعام یافتہ ادیب، ہرمین ہیسے (Hermann Hesse) نے اقبال کے تخلیقی سرچشموں کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی اور اسلامی فکر کے ساتھ مغربی فلسفہ وفکر کو بھی ان کا ایک اہم ماخذ قرار دیا ہے جس پر ایک فلسفی کی حیثیت سے اقبال کی گہری نظر تھی۔ اور انہوں نے ہیگل، نطشے اور برگساں کے فلسفیانہ دبستانوں کا پیروکار نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا[1]۔

اقبال اور مغرب کے حوالے سے اردو میں طویل مباحث رقم کیے گئے ہیں۔ معروف اقبال شناسوں نے بھی اس اہم موضوع پر اظہار خیال کیا ہے لیکن ایسی تحریریں بھی نظر سے گزرتی ہیں جن سے یہی تاثر ملتا ہے کہ اقبال نے مغرب اور تہذیب مغرب کو محض ہدف تنقید ہی بنایا ہے اور اس کی کوئی علمی وتہذیبی خوبی ان کو تسلیم نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے تعلیمی سفر میں انہوں نے نہ صرف مغربی اساتذہ سے کسب فیض کیا، بلکہ ان کے گہرے اثرات قبول بھی کیے اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ پروفیسر تھامس آرنلڈ (Prof. T.W. Arnold) جیسے استاد کی جوہر شناسی، رہنمائی اور سرپرستی، اقبال کی ان کے ساتھ سچی وابستگی کا ذریعہ بن گئی اور ان کو مغرب کے علمی سرچشموں تک کشاں کشاں لیے چلی گئی۔

(پروفیسر نکلسن اور ترجمہ ''اسرار خودی'' Secrets of the Self)

اقبال نے مغرب کی معروف درسگاہوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور حصول تعلیم کے سلسلے میں قیام یورپ کے زمانے (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) نے ان کے فکری ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مغربی افکار ونظریات کا نہ صرف انہوں نے عمر بھی مطالعہ کیا بلکہ اپنے نتائج فکر کو اپنے فکری مباحث کا حصہ بنایا۔ دوسری جانب اہل مغرب نے بھی، ان کی زندگی ہی میں ان کے شعری ونثری افکار کا خیر مقدم کیا

اوران کے خیالات کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور اس طرح مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کا آغاز ہوا جس کے لئے پروفیسر نکلسن (Prof. R.A.Nicholson) (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۵ء) تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے ۱۹۱۵ء میں شائع ہونے والی اقبال کی فلسفیانہ فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' کو اقبال کی اجازت سے ۱۹۱۹ء میں ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ "The Secrets of the Self" کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ کیا[۲]۔ اور یہی انگریزی ترجمہ مغربی دنیا میں اقبال کے پہلے باضابطہ تعارف کا ذریعہ بنا گو کہ اس سے پہلے ان کا تحقیقی مقالہ "Development of Metaphysics in Persia" وہاں شائع ہو چکا تھا۔

پروفیسر نکلسن ٹرنٹی کالج کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے السنہ ہند کے ٹرائی پوس میں درجہ اول میں کامیابی حاصل کی تھی اور وہیں ۱۸۹۳ء میں کالج کے فیلو منتخب ہونے کے بعد پروفیسر ای۔ جی براؤن (Prof. Brown) (۱۸۶۲ء۔۱۹۲۶ء) کے ساتھ کام کیا۔ وہ ۱۹۲۶ء میں پروفیسر براؤن کی وفات کے بعد ان کی جگہ "Thomas Adams Professor of Arabic" مقرر ہوئے۔ انہیں اسلام کے ساتھ لگاؤ تھا اور اس میدان میں ان کی علمی تحقیقات کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کا فیلوشپ کے حصول کے لئے لکھا جانے والا مقالہ مولانا رومی کی منظومات کے انتخابات اور تبصرے پر مشتمل تھا اور دیوان شمس تبریز کا ترجمہ (۱۸۹۸ء) ان کی اہم تخلیقات میں شامل ہے[۳]۔

خوش قسمتی سے ''اسرار خودی'' کی اشاعت کے فوراً بعد پروفیسر نکلسن کو اس کے مطالعہ کا موقع ملا۔ وہ اس کے منفرد موضوع اور اقبال کی فنی مہارت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے، جیسا کہ انہوں نے ''تعارف'' میں لکھا ہے کہ ''اس نظم نے نوجوان ہندوستانی مسلمانوں میں ہلچل پیدا کر دی ہے اور ایک مسیحا کی مانند مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک دی ہے''[۴]۔

''اسرار خودی'' جیسی فلسفیانہ نظم کا منظوم انگریزی ترجمہ اتنا سہل نہیں تھا۔ باوجود یکہ پروفیسر نکلسن کو کیمبرج میں اقبال کے خیالات سے آشنائی کے مواقع حاصل رہے تھے، انہوں نے

کیمبرج میں تحقیق میں مشغول ڈاکٹر محمد شفیع سے بھی ''اسرار خودی'' کی تفہیم میں مدد لی۔لیکن بالآخر خود اقبال سے فرمائش کی کہ وہ مثنوی میں بیان کردہ اپنے خیالات کو اجمالی صورت میں انگریزی میں انہیں لکھ بھیجیں۔اقبال نے دس بارہ صفحات پر مشتمل اپنے خیالات کو ایک مضمون کی صورت میں قلمبند کر دیا جسے پروفیسر نکلسن نے اپنے انگریزی ترجمے کے تعارف میں شامل کر لیا(۵)۔

اقبال نے اپنے خیالات کو درج ذیل تین عنوانات کے تحت بیان کیا:۔

(اسرار خودی کی فلسفیانہ اساس)

1. The Philosophical Basis of the Asrar-e-Khudee

(خودی اور شخصیت کا تسلسل)

2. The Ego and the continuation of personality

3. The Education of the Ego (تربیت خودی)

اس کے باوجود پروفیسر موصوف نے نظم کے مغربی قارئین کی الجھنوں اور ترجمے کی مشکلوں کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ممکن ہے کہ مطالب کے اظہار میں چند اغلاط راہ پا گئی ہوں(٦)۔

پروفیسر نکلسن نے نظم کی تاثیر کا اعتراف کیا ہے کہ یہ دل و دماغ میں چھا جانے والی نظم ہے جس کے بعض حصے ناقابل فراموش ہیں مثلاً اس مثالی انسان کا بیان جس کا زمانے کو انتظار ہے اور وہ بے بہا دعا جس کے ساتھ یہ نظم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے(۷)۔

پروفیسر نکلسن کے اعتراف کے باوجود بعض اصحاب نے ترجمے کی اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے سخت الفاظ بھی استعمال کئے جیسا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے ایک مضمون میں خواجہ غلام السیدین کا حوالہ دیا ہے(۸)۔یا پھر جسٹس ایس۔اے رحمٰن نے ''اسرار خودی'' کے اردو ترجمہ ''ترجمانِ خودی'' کے سر آغاز میں لکھا:

> ''ڈاکٹر نکلسن نے اس ترجمہ (انگریزی ترجمہ) کے ذریعے اقبالیات کی نہایت گراں قدر خدمت سر انجام دی تھی۔

انھوں نے ہی پہلے پہل کلام اقبال سے مغربی دنیائے ادب
کو روشناس کرایا لیکن بعض اشعار کا صحیح مفہوم سمجھنے سے 'میری
ناقص رائے میں' وہ قاصر رہے۔ تاہم ان کی بیش بہا خدمات
کا اعتراف نہ کرنا ایک اخلاقی اور ادبی گناہ ہوگا''(۹)۔

جسٹس رحمٰن مرحوم نے ایسے اشعار کی نشاندہی نہیں کی جس میں مفہوم صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکا حالانکہ ایسے اشعار ان کے منظوم اردو ترجمے میں بھی موجود ہو سکتے ہیں اور پھر ترجمے کے معیار پر بھی مختلف آراء ہو سکتی ہیں۔ خود ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنے عالمانہ مقدمے میں بڑے لطیف پیرائے میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ:

''ترجمے میں اصل والی بات کبھی نہیں آسکتی خواہ جسٹس رحمٰن
جیسا ذہین و فطین اور نظم و نثر پر قادر اہل قلم ہی ایسی ہمت
کرے''(۱۰)۔

پروفیسر آربری اور اقبال

پروفیسر نکلسن نے اپنی علمی عظمت کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنی اغلاط کو تسلیم کیا بلکہ اقبال کی طرف سے کی گئی اصلاح کی روشنی میں دوسرے ایڈیشن میں ان اغلاط کو دور بھی کیا جس کی گواہی خود پروفیسر آرتھر جان آربری (A.J.Arberry) نے "Notes on Iqbal's Asrar-e-Khudi" میں فراہم کی ہے (۱۱)۔

ان نوٹس کو ترتیب دینے کی حکایت پروفیسر آربری نے یوں بیان کی ہے کہ ۱۹۴۵ء میں پروفیسر نکلسن کی وفات کے بعد ان کی لائبریری کیمبرج کے ایک معروف کتب فروش کو بیچ دی گئی۔ ایک روز ان کتابوں کی ورق گردانی کے دوران ان کے ہاتھ پروفیسر نکلسن کے ''اسرار خودی'' کے انگریزی ترجمے (پہلا ایڈیشن ۱۹۲۰ء) کی ایک ایسی جلد ہاتھ لگی جس پر جا بجا تصحیح نوٹس اور حواشی درج تھے جو یقیناً مترجم کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ یہ تصحیحات اور حواشی خود سر محمد اقبال نے درج کئے تھے اور بعد میں

کیمبرج میں زیر تعلیم جناب جاوید اقبال (فرزند اقبال) کو جب یہ کتاب دکھائی گئی تو انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی کہ حواشی و تصحیحات ان کے والد کی ہی تحریر میں ہیں[۱۲]۔

پروفیسر آربری نے ''نوٹس'' میں ایسے ۷۸ مصرعوں کی نشاندہی کی ہے جن میں ترامیم و تصحیحات تجاویز کی گئی ہیں' جن کا مطالعہ مفید اور دلچسپ ہے۔ ''اسرار خودی'' کے ترجمے میں جن تسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے اور جن کو پروفیسر نکلسن نے کھلے دل کے ساتھ تسلیم بھی کیا ہے' ان کے باوجود پروفیسر موصوف کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوتی بلکہ اس ترجمے کے ذریعے اس تنقیدی بحث کا آغاز بھی ہوتا ہے جس سے مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کو وسعت پذیر ہونے کا موقع ملا ہے۔

پروفیسر ڈکنسن اور فاسٹر کے تبصرے

اس ضمن میں پروفیسر ڈکنسن' ای۔ ایم۔ فاسٹر اور سر ہربرٹ ریڈ کے نام لئے جاسکتے ہیں جو براہ راست ''اسرار خودی'' کے پروفیسر نکلسن کے انگریزی ترجمہ کے ذریعے سے اقبال سے متعارف ہوئے اور انہوں نے اس پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

پروفیسر ڈکنسن کا تبصرہ انگلستان کے رسالے "Nation" اور ای۔ ایم فاسٹر کا "Athenium" میں ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ ان دونوں کے جواب میں علامہ اقبال نے پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط لکھا جس میں نکلسن' فاسٹر اور ڈکنسن تینوں کے خیالات پر جوابی تنقید کی۔ یہ خط رسالہ "Quest" میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق مذکورہ تنقیدی تحریروں اور اقبال کے خط کے اردو تراجم مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے ستمبر ۱۹۲۱ء' جون ۱۹۲۱ء اور اکتوبر ۱۹۲۱ء کے شماروں میں شائع ہوئے[۱۳]۔

سید عبداللہ کی رائے میں:

''جہاں اقبال کے مقامی نقادوں کا مرکزی نکتۂ بحث تصوف کی حمایت و مخالفت' وحدت الوجود و الشہود کی تردید و تائید

> اور خودی و بے خودی کی تحقیق تھی وہاں مغرب کے ان
> نقادوں نے مغربی ماحول اور مغربی ذہن کے مطابق اقبال
> کے فلسفہء خودی پر جرح کرتے ہوئے اور اسے احیائے
> اسلام کی ایک سعی قرار دیتے ہوئے یورپ کو آنے والے اس
> خطرے سے ڈرایا جو ''اسرار خودی'' کی حکمت سے (ان کی
> رائے میں) پیدا ہو سکتا تھا'' (۱۴)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد مغربی دانشوروں بالخصوص امریکی پالیسی سازوں نے اسلام کو ایک ممکنہ خطرہ ''ہوّا'' بنا کر پیش کرنے اور اکیسویں صدی کے آغاز میں سیموئل۔ پی ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilizations) کی بحث میں اسلام کو مغرب یا تہذیب مغرب کے ایک ممکنہ مدمقابل یا حریف کے طور پر پیش کرنے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ محض آج کے حالات کا کوئی پہلا فوری ردعمل نہیں ہے بلکہ انہی خیالات یا زیادہ صحیح طور پر خدشات کو بیسویں صدی کی دوسری' تیسری دہائیوں میں پروفیسر ڈکنسن اور فارسٹر کی ''اسرار خودی'' پر تنقید میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی نو آبادیات میں ایسی کسی بھی کاوش کو جو فکر و شعور کو اجاگر کرتی اور عمل کی اساس پر زور دیتی ہو' حقیقی معنوں میں برٹش امپریلزم کے لئے خطرہ قرار دینا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا نہ ہی آج کے عہد میں مشکل ہے۔

حالانکہ اقبال نے ڈکنسن اور فاسٹر کی تنقید کے جواب میں پروفیسر نکلسن کے نام اپنے خط (مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء) میں واضح کیا کہ:

> ''میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر
> یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت
> میں دعوت پیکار (ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کے لئے ''دعوت
> جہاد'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں' دیکھئے ص ۱۳) دی جائے تو
> میرے عقیدے کی رُو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا

فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا
مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو''۔[(۱۵)]

اسی خط میں آگے چل کر علامہ لکھتے ہیں:

''میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ
میری قوت طلب وجستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ
ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے' اور عقلاً یہ ناممکن
معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام
سے قطع نظر کرلیا جائے جس کا بین مقصد وحید ذات پات'
رتبہ و درجہ' رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دیتا
ہے''[(۱۶)]۔

پروفیسر ڈکنسن اور فاسٹر کے علاوہ اسی زمانے میں ایک مضمون ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) نے بھی بعنوان "Readers & Writers" تحریر کیا جو "The New Age" (۲۵ اگست ۱۹۲۱ء) میں شائع ہوا اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر بلحاظ اہمیت یہ ڈکنسن اور فاسٹر کے مضامین سے اس بناء پر کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ ڈکنسن کا مضمون معاندانہ ہے اور اسلام کے بارے میں مغرب کے مخصوص متعصّبانہ رویہ کا مظہر ہے۔ فاسٹر نے البتہ ہمدردانہ رویہ اپناتے ہوئے علامہ کو ''بلبلِ ہند'' بھی قرار دیا لیکن ہربرٹ ریڈ نے جس پُر جوش الفاظ میں علامہ کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا اس بناء پر اس کا یہ مختصر مضمون دائمی اہمیت کا حامل قرار پاتا ہے[(۱۷)]۔

ہربرٹ ریڈ نے اپنے مضمون میں ادبی معیارات پر بحث کرتے ہوئے ڈی۔ ایچ لارنس اور والٹ وہٹمین کو بھی موضوع بنایا ہے اور ادبی اظہار اور روحانی مسرت کی آخری حد ان کے نزدیک مابعد الطبیعیات ہے اور صحائف' ادب عالیہ اور عظیم تصانیفِ فلسفہ کی مرکزیت مذہبی روح ہی ہے جس کے اثر سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے عہد کی ادبی صورت حال پر نظر

ڈالتے ہوئے صرف اقبال ہی کو ایک زندہ شاعر قرار دیتے ہیں جو ان کے ادبی معیار پر پورا اترتا نظر آتا ہے حالانکہ وہ ایک ایسا شاعر ہے جو ان کے عقیدے اور نسل سے بھی تعلق نہیں رکھتا(۱۸)۔

یقینی طور پر مذکورہ تحریروں کا محرک پروفیسر نکلسن کے انگریزی ترجمہ "The Secrets of the Self" ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر اے۔ جے آربری(Prof. A.J.Arberry) کا تذکرہ "Notes On Iqbal's Asrar-i-Khudi" کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ کلام اقبال کے انگریزی تراجم کے حوالے سے ان کی کاوشوں کا دائرہ وسیع بھی ہے اور وقیع بھی، جس کا اندازہ ان پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے:۔

۱۔"The Tulip of Sina" (پیام مشرق کی رباعیات ''لالہ طور'' کا ترجمہ، جسے رائل انڈین سوسائٹی لندن نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا)۔

۲۔"Persian Psalms" (زبور عجم کے منتخب حصوں کا ترجمہ، اشاعت ۱۹۴۸ء)

۳۔"The Mysteries of Selflessness" (رموز بے خودی کا ترجمہ، لندن سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا)

۴۔"Iqbal's Complaint and Answer" (ترجمہ شکوہ، جواب شکوہ، لاہور سے شیخ محمد اشرف نے پہلی بار ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۹۲ء میں بھی شائع ہوئے)

۵۔"Jawaid Nama" (ترجمہ، جاوید نامہ، لندن ۱۹۶۶ء)

پروفیسر اے۔ جے آربری کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے "Sir Thomas Adams Professor" کے منصب پر فائز رہے۔ آپ کیمبرج کی اس علمی روایت کے امین تھے جس میں پروفیسر براؤن، رینالڈ نکلسن اور سرڈینی راس جیسے فضلاء کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ آپ نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ تصوف کی بعض اہم کتابوں کے تراجم:۔

"Book of Cognitive اور "Introduction of Mysticism"
"Panses and Dialogues کی صورت میں موجود ہیں۔ پروفیسر آربری کی تصنیف
"Revelation and Reason in islam" نے بھی علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کی۔

پروفیسر آربری کی علمی بصیرت' دیانت' ژرف نگاہی اور وسعت کا علمی اور اقبالیاتی حلقوں میں ہمیشہ اعتراف کیا گیا ہے اور اس کو اعتماد کا مظہر بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ سید عبداللہ نے بھی مطالعہء اقبال کے سلسلے میں آربری کے نقطہء نظر کو فارسٹر اور ڈکنسن کے مقابلے میں حقیقت پسندانہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک:۔

آربری مسلمان ذہن اور ثقافت سے پوری طرح واقف ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کی روح کی گہرائیوں تک پہنچتے ہیں اور اس کی تنویر سے آشنا ہیں۔ اس طرح اور اس پس منظر کے ساتھ آربری یورپ میں مطالعہ اقبال کے سلسلے میں قابل اعتماد راہنما نظر آتے ہیں [۱۹]۔

اطالوی اسکالر ایساندرو بوسانی

ایساندرو بوسانی: اطالیہ میں اقبال کا باقاعدہ تعارف پروفیسر ایساندرو بوسانی (Alessandro Bausani) کے ذریعہ سے ہوا جن کا ترجمہ جاوید نامہ (Il Poema Celesto) ۱۹۵۲ء میں روم سے شائع ہوا اور جلد ہی علمی مجالس میں موضوع بحث بن گیا۔ اگرچہ ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے ۱۹۲۱ء میں روم کے مشرقی انسٹی ٹیوٹ (Instituto Per I,orcente) کی طرف سے ایک ماہانہ مجلے "Oriente Moderno" (مشرق جدید) کی اشاعت کا تذکرہ کیا ہے جس کا مقصد اٹلی کے باشندوں کو دنیائے اسلام کے تازہ ترین واقعات سے باخبر رکھنا تھا اور اسی مجلے کے سیاسی اور تہذیبی حصے میں اقبال پر مضامین شائع ہوتے تھے [۲۰]۔ جیسے ماریا نیلینو (Maria Nalino) کا علامہ اقبال پر مضمون (۱۹۳۲ء)' آرتھر جیفری (Arther Jaffery) اور ٹیفرل (G.Tafferel) کے مضامین (۱۹۳۸ء) اور ریاض الحسن کا اطالوی زبان میں اقبال پر مضمون (۱۹۳۷ء) میں شائع ہوئے [۲۱]۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مضامین اقبال شناسی کی باقاعدہ روایت کا آغاز نہیں بن سکے تھے

اور نہ ہی آغا صاحب نے اپنی کتاب میں ان مضامین پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی اہمیت کا کوئی اندازہ قائم ہوتا ہو لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اطالوی دانشوروں میں اقبال شناسی کی باقاعدہ روایت کے آغاز کا سہرا پروفیسر بوسانی کے سر ہے بلکہ یہ کہنا بھی درست ہے جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ ''اٹلی میں پروفیسر ایساندرو بوسانی اپنی ذات میں اقبال شناسی کے ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں [۲۲]۔ اور اقبال کے فلسفیانہ افکار کی تشریح و توضیح میں قلمبند کئے جانے والے مقالات اور ''پیام مشرق''، ''بانگ درا''، ''زبور عجم''، ''بال جبریل''، ''ضرب کلیم'' اور ''ارمغان حجاز'' کی منتخب منظومات کے اطالوی تراجم کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اکیلے بوسانی نے ہی اتنا کام کر لیا ہے کہ اب اٹلی کا ہر پڑھا لکھا شخص کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکتا ہے [۲۳]۔

پروفیسر ایساندرو بوسانی، جنہیں برصغیر کے معروف اقبال شناس، جگن ناتھ آزاد نے ان کی اقبال شناسی کے ساتھ سچی اور گہری وابستگی کے پیش نظر ''عارف اقبال'' اور ''عاشق اقبال'' جیسے القابات سے یاد کیا ہے [۲۴]۔ ۱۹۲۱ء میں روم (Italy) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مشرقی زبانوں میں سے عربی، ترکی، فارسی اور اردو میں خصوصی دسترس حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں روم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۷ء تک روم یونیورسٹی میں ہی فارسی ادبیات کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کو نیپلز میں قائم مشرقی علوم کے ادارے میں صدر شعبہ اردو اور فارسی مقرر کر دیا گیا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کے اعتراف کے طور پر ۱۹۵۹ء میں ان کو صدر پاکستان نے ''ستارہ امتیاز'' کے اعزاز سے نوازا۔

پروفیسر بوسانی نے اردو زبان و ادب، اس کی تاریخ اور اہمیت پر بھی مقالات تحریر کئے ہیں اور غالب کی شاعری کا جائزہ بھی لیا ہے لیکن اقبال سے خصوصی شغف کے پیش نظر انہوں نے عمر بھر اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائے رکھا۔ ''جاوید نامہ'' کے اطالوی ترجمہ (۱۹۵۲ء) کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

○ ''دانتے اور اقبال'' (Dante & Iabal) کے عنوان سے ایک اہم مقالہ "East and West" (روم ۵۲۔۱۹۵۱ء) میں شائع ہوا اور پھر "Pakistan Miscellany" کے

شمارے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ ''ماہ نو'' (اقبال نمبر ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے۔

○ ابلیس۔ اقبال کی فلسفیانہ نظموں میں (۱۹۵۵ء) اس کے کئی اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں [۲۵]۔

○ اقبال کے تصورِ زمان پر ایک مبسوط مقالہ انہوں نے "Concept of Time in The Religious Philosophy of Iqbal" کے عنوان کے تحت جنوری ۱۹۵۵ء میں سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد کے ایک جلسے میں پڑھا [۲۶]۔

اقبال عالمی کانگریس (منعقدہ دانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۹۷۷ء) میں انہوں نے جو مقالہ پیش کیا اس کا عنوان تھا:۔

"The Medieval Religiousity of Dante and Modern Religion of Iqbal"

جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ اقبال کے پیغام کی حقیقی روح اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ بیک وقت پیغمبرانہ، صوفیانہ اور تاریخی حرکیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور ایسا اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ انہوں نے عیسائی روایت کے برعکس، اسلامی روایت کے مثبت عناصر، تصوف، نبوت اور سائنسی حکمت کو ایک وحدت کے طور پر بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔

اسی مضمون کے اختتام پر وہ ''حقیقی اقبال'' کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں جو اس اقبال سے مختلف ہے جو عورتوں کو پردے میں رہنے کی تلقین کرتا ہے اور ''رموزِ بے خودی'' میں جابرانہ ماحول میں رجعت پسند قوتوں کی اطاعت کا درس بھی دیتا ہے۔ ''حقیقی اقبال'' پر زور دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ جدید انسان بلکہ مستقبل کے انسان کی بھی نئی دنیا کی تخلیق میں مددگار ثابت ہوتا ہے [۲۷]۔

معروف جرمن مستشرق ڈاکٹر این میری شمل کی اقبالیاتی خدمات

پروفیسر نکلسن اگر مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کی ابتداء ہیں تو بلاشبہ

ڈاکٹر این میری شمل کو اس روایت کی انتہا قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ:۔

بیسویں صدی کی اس معروف مستشرق نے فلسفہ و ادب' تصوف' تقابل ادیان' روحانیت اور بالخصوص اقبال شناسی کے میدان میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے (۲۸)۔

۱۹۲۳ء میں Erfurt (جرمنی) میں پیدا ہونے والی این میری شمل کی فطانت' علم و ادب کے مختلف شعبوں کے علاوہ مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں: جرمن (مادری زبان)' فرانسیسی' عربی' فارسی' ترکی' انگریزی' اردو' پنجابی اور سندھی میں مہارت کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے شدید ہنگامی حالات کے دوران انہوں نے ''مصر میں عہد مملوک میں خلیفہ اور قاضی کا کردار'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر صرف انیس برس کی عمر میں برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے دوسری بار ڈاکٹریٹ تاریخِ مذاہب کے پروفیسر فریڈرک ہیلر کے اشتراک سے مکمل کی۔

وہ ماربرگ (۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۴ء)' انقرہ (۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء)' بون (۱۹۶۱ء) کی درسگاہوں کے علاوہ ہارورڈ یونیورسٹی (۱۹۶۷ء سے ۱۹۹۲ء) میں اپنی ریٹائرمنٹ تک تقریباً پچیس برس تک انڈو مسلم کلچر کی پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس میں مصروف رہیں۔ انہوں نے دنیا بھر میں عالمی سطح کے اداروں میں مختلف موضوعات پر خطبات پیش کئے اور ہزاروں تشنگان علم کو اپنی علمی بصیرت سے فیض یاب کیا۔ لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائی' سچل سرمست اور اقبال کے وطن سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ ۱۹۵۸ء میں اپنے پہلے دورۂ پاکستان کے بعد سے اپنی وفات (۲۰۰۳ء) تک مسلسل پاکستان تشریف لاتی رہیں۔ اقبال پر اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "Gabriel's Wing" کی تیاری کے سلسلہ میں وہ کئی ماہ تک پاکستان میں مقیم رہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں پہلی بار ہالینڈ سے شائع ہوئی اور پاکستان میں اقبال اکادمی نے اسے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں جہاں ہمیشہ ڈاکٹر شمل کے علم و فضل کو سراہا گیا

وہیں حکومتی سطح پر بھی ان کو ۱۹۶۵ء میں ''ستارۂ قائداعظم''، ۱۹۸۳ء میں پاکستان کے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ ''ہلال امتیاز'' اور ۱۹۹۸ء میں عالمی صدارتی اقبال ایوارڈ اور گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ ملک کی تین یونیورسٹیوں: سندھ یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں بھی پیش کی جا چکی ہیں۔ لاہور کی ایک خوبصورت سڑک کو بھی ان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شمل کے تحقیقی موضوعات کا دائرہ متنوع بھی ہے اور وسیع بھی۔ اسلامی تاریخ، سیرت رسولؐ، اقبالیات، تصوف، روحانیت، اردو اور فارسی شاعری، خطاطی، علم الاعداد اور جرمن مستشرقین کے علاوہ متفرق موضوعات پر ان کی سو سے زائد باقاعدہ تصانیف اور دو سو کے قریب تحقیقی مقالات کے جائزے سے بھی ان کے تبحر علمی کی وسعتوں کا کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔(۲۹)

لیکن ہمارے کتب خانوں میں ان کی کچھ منتخب تصانیف ہی موجود ہیں جن میں سے چند کتابیں ہی ابھی تک اردو میں ترجمہ ہو سکی ہیں۔ افکار اقبال پر مبنی تصنیف "Gabriel's Wing" (اردو ترجمہ: شہپر جبریل) کو پاکستان میں زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں شائع ہونے والی ''برصغیر میں اسلام'' دراصل ان کی کتاب "Islam in the Indian Sub-Continent" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ "Mystical Dimensions of Islam", "Muhammad, The Messenger of Islam" اور خواجہ میر دردؔ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی صوفیانہ شاعری کے تقابلی مطالعے پر مبنی تصنیف:

"Pain And Grace" حال ہی میں پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ جرمن اور ترکی زبانوں میں ان کا شائع ہونے والا کام بھی انگریزی میں ترجمہ ہو کر ہی پاکستان اور دوسرے ممالک تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

''اقبالیات'' ڈاکٹر شمل کا محبوب اور مرغوب موضوع ہے جس کے ساتھ ان کی دلچسپی

اور وابستگی عمر بھر قائم رہی۔ برلن میں زمانہ ءطالب علمی کے دوران ہی اقبال کے اشعار اور افکار سے آشنائی ہوئی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔۱۹۵۴ء میں اقبال پر اپنی پہلی تحریر کی اشاعت کے بعد انہوں نے اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زبانوں میں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۶۴ء میں اقبال کے دینی افکار کے مبسوط مطالعہ پر مبنی "Gabrel's Wing" منظر عام پر آئی جس کو حکومت پاکستان نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۱ء کے دوران کسی بھی غیر ملکی زبان میں اقبال پر لکھی جانے والی بہترین تصنیف قرار دیا ہے۔

۱۹۸۱ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ ''شہپر جبریل'' بجا طور پر اس دعویٰ کے ساتھ شائع کیا گیا کہ مجموعی طور پر اقبال پر لکھی جانے والی عمدہ اور اعلیٰ کتابوں میں سے ایک ہے۔ جس طریقے سے مصنف نے اقبال کے مذہبی افکار کو اسلام کے اساسی عقائد اور ایمان مفصل کی ترتیب سے پیش کیا ہے' یہ ان کی جدت اور ندرت کا آئینہ دار ہے اور اس انداز کی اقبال پر کوئی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی (۳۰)۔

ڈاکٹر شمل نے اس تصنیف کے بارے میں اپنے تحقیقی موقف کی وضاحت اس طرح سے کی ہے:

> ''اگر چہ (اقبال کے بارے میں) پہلے سے کہی گئی باتوں کو دہرا دینا میرے لئے بہت آسان تھا لیکن میں نے اس سے گریز کرتے ہوئے کوشش کی ہے کہ اقبال خود بولتا ہوا نظر آئے نہ کہ اس کے ناقدین۔ میں نے اس کے طرزِ فکر و ادا اور مصائب و آلام سے بچنے کے لئے مذہب کے دامن میں اس کے سکون اور پناہ حاصل کرنے کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے'' (۳۱)۔

اقبالیاتی ادب میں ایک گراں قدر مقام کی حامل "Gabriel's Wing" پانچ

ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب' حیات وتصانیف اقبال اور اس کے تاریخی پس منظر پر مشتمل ہے جس میں ان کی تخلیقات کے جمالیاتی پہلو اور ان کے مذہبی مقاصد پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ارکان اسلام کی تشریح اور تیسرے باب میں ایمان مفصل کی توضیح کی گئی ہے۔ چوتھا باب فکر اقبال پر مشرق ومغرب کے اثرات کے جائزے اور ان کے تصوف سے متعلق خیالات پر مبنی ہے۔ پانچویں یعنی آخری باب میں انہوں نے اپنی تمام تر بحث کا حاصل پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر شمل کے نزدیک اقبال اہل پاکستان کے لئے محض ایک فلسفی شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ایسی کرشمہ ساز قوت کی صورت اختیار کر گیا ہے جو اس نو آزاد مملکت کو لاحق خطرات میں اس کے تحفظ کی ضامن بھی ہے [۳۲]۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر شمل کی اقبالیات پر سات مزید مستقل تصانیف بھی ملتی ہیں جن میں ''جاوید نامہ'' کا ترکی زبان میں نثری ترجمہ (۱۹۵۵ء) اور جرمن میں منظوم ترجمہ (۱۹۵۷ء)' پیام مشرق کا جرمن ترجمہ (۱۹۶۳ء) شامل ہیں۔ اقبالیات کے موضوع پر مختلف عنوانات کے تحت لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کی تعداد چودہ کے قریب ہے جن میں سے بعض کے اردو تراجم مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

سالِ اقبال ۲۰۰۲ء کے حوالے سے شائع ہونے والی محمد اکرام چغتائی کی انگریزی تالیف " Iqbal-New Dimensions " (اقبال۔نئی جہات) میں اقبالیات سے متعلق نایاب اور غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر شمل کے درج ذیل چھ مقالات بھی شامل ہیں:۔

۱۔محمد اقبال	1. Muhammad Iqbal
۲۔اقبال کی فارسی شاعری	2. Iqbal's Persian Poetry
۳۔اقبال اور کلاسیکی اسلامی روایت	3. Iqbal & Classical Islamic Tradition

۴۔ محمد اقبال۔ ایک مغربی مذہبی مورخ کی نظر میں	4. Muhammad Iqbal - As seen by Eurepean Historian of Religion
۵۔ افکار اقبال پر مغرب کے اثرات	5. The Western Influence on Sir Muhammad Iqbal's Thought"
۶۔ مستقبل میں مطالعہ اقبال کی اہمیت	6. Some Thoughts about Future studies of Iqbal.

مذکورہ کتاب کا انتساب مغربی اقبال شناسوں: پروفیسر شمل (جرمنی)' برگال (سوئٹزر لینڈ)' ایساندرو بوسانی (اٹلی)' پروفیسر نکلسن (برطانیہ)' اے۔ جے آربری (برطانیہ)' ایوا ماریوچ (فرانس)' شیلا میکڈونف (کینیڈا)' نتالیا پری گارینا (روس)' اوریاں ماریک (چیکوسلواکیہ) کے نام ہے[۴۳]۔

ڈاکٹر شمل کے نام کو سرفہرست رکھا گیا ہے جس سے مغربی اقبال شناسوں میں ان کی منفرد اور مسلمہ حیثیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ان چند ممتاز مغربی اقبال شناسوں کے علاوہ' جن کا تذکرہ ہم پہلے کر آئے ہیں' ایسی شخصیات کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے جنہوں نے مغرب میں اقبال شناسی کی عالمی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن چونکہ ہمارا مقصد مغرب میں اقبال شناسی کی باقاعدہ تاریخ مرتب کرنا نہیں صرف اقبال شناسی کی عالمی روایت کا ایک ایسا مختصر جائزہ پیش کرنا ہے۔ اس کے لئے ہم نے چند اہم مثالوں پر اکتفا کیا ہے البتہ اس روایت میں ایوا مایوچ' لوس کلوڈ میتیخ' شیلا میکڈونا' یاں ماریک' ایلسن لوئی ماسینون' باربرا متکاف' وکٹر کرنن' رس بروک' ایڈورڈ تھامسن' کینٹ ویل سمتھ اہم ہیں' جن کے نام اور کام کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نتالیا پری گارینا' ستے چین نتیس' ڈاکٹر سخاحوف اور گورڈن پولنسکا یا کی اقبال شناسی کا جائزہ الگ

سے روس کے حوالے سے کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے اس لئے ان کو مغربی اقبال شناسوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔

ایوا ماریوچ، لوئی میسنون اور لوئس کلوڈ میتیخ (فرانس) کا مطالعہء اقبال

فرانسیسی سکالرز میں سے لوس کلوڈ میتیخ (Luce Claude Maitre) اور ایوا ماریوچ(Eva Meyeroviteh) نے افکار اقبال کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔

لوس کلوڈ کا فکر اقبال کے تعارف پر مبنی مختصر مگر مبسوط مقالہ ۱۹۵۵ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے انگریزی اور اردو میں ترجمہ کیا جا چکا ہے (۳۴)۔

لوس کلوڈ میتیخ نے فکر اقبال پر قرآن کے گہرے اثرات کو تسلیم کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اقبال نے اپنا راستہ اس کی روشنی میں متعین کیا ہے۔ اور قرآن میں نہ صرف انسان کی انفرادیت بلکہ انسان کامل کے تصور پر اِصرار نظر آتا ہے۔ اقبال نے خودی کا جو تصور پیش کیا ہے' اس کے نشر و ارتقا اور استحکام کا باعث بھی وہ مثالی معاشرہ ہی بن سکتا ہے جو قرآن کے دیئے ہوئے قواعد اور ضوابط کا پابند ہے۔

لوس کلوڈ میتیخ نے افکار اقبال پر مغربی فلاسفہ جیسے نطشے اور برگساں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ایسے تمام نظریات کی دوٹوک الفاظ میں تردید بھی کی ہے (۳۵)۔

لوس کلوڈ میتیخ کی ایک ہم عصر اور ہم وطن' مادام ایوا ماریوچ(Eva Meyeroviteh) بھی انہی کی طرح افکار اقبال کی شیدائی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں خطبات اقبال (Reconstruction of Religious Thougt In Islam" کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جس کا مقدمہ معروف فرانسیسی مستشرق' لوئی میسنون (Louis Massignon) نے لکھا۔ یہ وہی میسنون ہیں جنہوں نے منصور حلاج کی صوفیانہ تصنیف ''الطواسین'' کو فرانسیسی میں مرتب کیا اور اس کے مفید حواشی بھی تحریر کیے۔ علامہ اس کی اس تحقیقی کاوش کے نہ صرف معترف تھے بلکہ انہوں نے اپنے بعض مکاتیب میں اس کام کو بہت سراہا ہے (۳۶)۔ اور ۱۹۳۲ء میں پیرس میں اس سے ملاقات بھی کی تھی۔

مسینون نے ''خطبات'' کے مقدمہ میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:۔

"It Is perhaps through philosophical work like the present one which Madame Meyeroviteh has chosen for translation from among the works of Iqbal, that the French public will aware of the growing possibilities offered by contemporary Islam to the European observer of seeing the advent of original thinkers worthy of being put on an equal footing with our thinkers"(۳۷)

ڈاکٹر سلیم اختر نے مادام ایوا ماریوچ کا موازنہ پروفیسر نکلسن کے ساتھ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فرانس کی اقبال شناسی کی روایت میں مادام ایوا ماریوچ کو وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی میں پروفیسر نکلسن کا ہے یعنی انہوں نے سب سے پہلے علامہ کی کتاب کا ترجمہ کیا۔ اس ضمن میں یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ انہوں نے ترجمہ کے لئے شاعری کو منتخب نہ کیا جس میں عام قارئین کے لئے یقیناً سامانِ کشش ہوتا ہے' بلکہ علامہ کی اس کتاب کا ترجمہ کیا جسے اکثریت نے بھاری پتھر سمجھ کر چوم کے چھوڑ دیا ہے۔ میری مراد تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے ہے جس کا خود اردو میں ڈھنگ کا ترجمہ نہ ہوسکا''(۳۸)۔

پروفیسر نکلسن اور مادام ایوماریوچ میں اگر کوئی قدر مشترک نظر آتی ہے تو وہ ان کا صرف مترجمینِ اقبال ہونا ہے۔ نکلسن کو مغرب میں اقبال شناسی کی روایت میں اولیت کا مقام حاصل ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کو اقبال کی زندگی میں' ان کی اجازت سے ان کی پہلی فلسفیانہ فارسی مثنوی کو ترجمہ کرنے اور اس ضمن میں اقبال سے اصلاح لینے کے مواقع بھی میسر تھے۔ ان کے انگریزی ترجمہ ''اسرارِ خودی'' (The Secrets of the Self) کے ذریعے سے اقبال نہ صرف مغرب میں متعارف ہوئے بلکہ علمی سطح پر موضوع تحقیق بھی بنے۔ مادام ایوا ماریوچ تک پہنچتے پہنچتے اقبال شناسی کی یہ روایت مغرب میں ترقی کی کئی منازل طے کر چکی تھی۔ اس کا مقصد مادام ایوا کے کام کی اہمیت کو کم کرنا یا کمتر سمجھنا ہرگز نہیں۔ ان کا کام لائق تحسین ہے اسی لئے تو مسینون جیسی معروف ہستی نے اس کا مقدمہ تحریر کرنے کو ترجیح دی گو کہ اس کے بعض حصوں پر بھی اصحاب نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا[۳۹]۔

جہاں تک خطباتِ اقبال کے ڈھنگ کے اردو ترجمہ نہ ہو سکنے کی شکایت ہے تو یہ بھی بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ سید نذیر نیازی کی (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ) کو مشکل اور دقیق ترجمہ تو ضرور خیال کیا گیا ہے لیکن اس ترجمے کے معیار اور اعلیٰ علمی اسلوب کے بارے میں دو آراء نہیں ہیں۔ اور اس کے بعد اب تک خطبات کے کئی تراجم' تشریحات و توضیحات منظر پر آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' پروفیسر عثمان' پروفیسر شریف بقا' شریف کنجاہی' شہزاد احمد' ڈاکٹر وحید عشرت' ڈاکٹر آصف اعوان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[۴۰]۔

مادام ایوا ماریوچ کی افکارِ اقبال کے ساتھ لگن کم نہیں ہوئی اور انہوں نے فرانس میں اقبال شناسی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے محمد ایکتا کے اشتراک سے: ''پیام مشرق'' (Message de l Orient) اور ''جاوید نامہ'' (Le Livre de l Eternite) کو فرانسیسی میں ترجمہ کر کے بالترتیب ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

ڈاکٹر شیلا میکڈونا کی اہمیت

ڈاکٹر شیلا میکڈونا (یا میکڈونف) (Dr. Sheila Mcdonough) کا نام بھی

ایک اہم مغربی اقبال شناس کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ سر جارج ولیم یونیورسٹی (مانٹریال۔ کینیڈا) کے شعبہء دینیات سے منسلک رہی ہیں۔ وہ (۶۰۔۱۹۵۷ء) کے دوران کنیرڈ کالج' لاہور میں انگریزی ادب اور تقابل ادیان کی استاد کی حیثیت سے کام کر چکی ہیں۔ انہوں نے کینیڈا کے McGill Institute of Islamic Studies سے "G. Perwez: A Study of Islamic Modernism" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ہے[۴۱]۔ وہ "Pakistan And the West" کی مصنفہ ہیں۔ اقبالیات کے موضوع پر ان کے مقالات:

"The Mosque of Cardova, Vision or Perish" اقبال سوسائٹی' واشنگٹن میں یوم اقبال کی تقریب منعقدہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۶ء میں پڑھا گیا (اقبال ریویو' کراچی' اپریل ۱۹۶۷ء میں بھی شامل ہے)۔

"Prophetic Faith in Iqbal, Buber and Tillich" اقبال عالمی کانگریس' لاہور منعقدہ ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا اور Iqbal Centenary Papers ۱۹۸۴ء اور ایم۔ اکرام چغتائی کی تالیف "Iqbal-New Dimensions" (۲۰۰۲ء) میں بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر شیلا میکڈونا نے مطالعہ اقبال کے بعد جو نتائج پیش کئے ہیں' ان کی رُو سے اقبال کو اس زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا جہاں تخلیق ادب محض ادبی اظہار یا ذریعہ مسرت کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہ اس تخلیقی تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کرنے کے آرزو مند ہیں اور خیالات کے موزوں اظہار کو ضروری خیال کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی اس مشکل اور جستجوئے الفاظ کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس تمہید کے بعد ڈاکٹر شیلا نے مسجد قرطبہ کا بڑی بصیرت کے ساتھ تجزیہ پیش کیا ہے کہ اس مسجد کی زیارت کے دوران اقبال پر کیا کیفیات طاری ہوئیں اور اس تجربے نے اسرار زمان سے متعلق ان کے شعور کو کیسے منور کیا اور ''وقت'' جسے تاریخ کی دہشت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے' اقبال اس سے کیسے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ بصیرت یا فنائیت (Vision or Perish) کے

الفاظ کا استعمال اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ سے یہ آگہی حاصل ہوتی ہے کہ مسجد نے اقبال پر کس حقیقت کو منکشف کیا تھا جسے وہ ہم پر ظاہر کرنے کے لئے مضطرب ہیں۔اور ہمیں بھی چاہئے کہ اس حقیقت کو دل میں اتارنے کی کوشش کریں [۴۲]۔

ڈاکٹر باربرا مٹکاف

امریکی دانشوروں میں سے ڈاکٹر باربرا مٹکاف نے' جن کا تعلق پنسلوانیا یونیورسٹی کے شعبہ میں جنوبی ایشیائی امور سے رہا ہے' اقبال عالمی کانگریس میں اقبال کی مسجد قرطبہ کو ہی اپنا موضوع بنایا۔اقبال کے افکار میں اس نظم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کے تاریخی پس منظر کو واضح کرتے ہوئے اندلس کی عظمت رفتہ کو مسلمانوں کے تابناک ماضی کی مثال قرار دیا۔ڈاکٹر باربرا نے اس بات پر زور دیا کہ اقبال نے مسجد قرطبہ کو خراج تحسین ہی پیش نہیں کیا بلکہ سنگ و خشت کی مسجد کے مقابلے میں حرف وصوت کی ایک عظیم مسجد تخلیق کی ہے۔

ڈاکٹر شیلا میکڈونا کی طرح انہوں نے بھی نظم کے فنی پہلوؤں کا بڑی دقتِ نظر سے جائزہ لیا ہے۔خاص طور پر وقت کے حوالے سے ''سلسلہء روز وشب'' کی تکرار اور ''تار حریر دورنگ'' اور ''قبائے صفات'' جیسی تراکیب کی وضاحت کی ہے۔

انہوں نے بھی اقبال کے تصور عشق کو بیان کرنے کے لئے ڈاکٹر این میری شمل کی "Gabriel's wing" کا سہارا لیا ہے اور زمانے کی تندوتیز رو کے بالمقابل عشق کو لا کھڑا کیا ہے جو خود اک سیل کی خصوصیات سے متصف ہوتے ہوئے زمانے کے سیل کو تھام لیتا ہے [۴۳]۔

ڈاکٹر یان ماریک

چیکوسلواکیہ (چیک ریپبلک) میں اقبال شناسی کے حوالے سے قابل ذکر نام ڈاکٹر یان ماریک (Dr. Jan Marek) کا ہے جن کے بارے میں ڈاکٹر سعید اختر درانی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اوائل عمر ہی میں ہندی اور اردو زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا اور وہ پچھلے چالیس سال سے پراگ یونیورسٹی کے اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ اور قدیمی چارلز یونیورسٹی میں اردو زبان

سے متعلق تحقیق وتدریس میں مشغول ہیں (۴۴)۔

ڈاکٹر یاں ماریک نے ۱۹۵۵ء میں اقبال کے اردو شعری مجموعہ ''ضرب کلیم'' کے تجزیہ پر مبنی ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اقبال کی تاریخ ولادت سے متعلق ان کا مضمون ۱۹۵۸ء میں پراگ کے ایک جریدے "Archiv Orientalni" (جلد ۲۶ ص ۶۱۷ تا ۶۲۰) میں شائع ہوا جو ڈاکٹر درانی کی تحقیق کے مطابق اقبال کی ولادت کے مسئلہ پر غالباً اولین مدلل اور تحقیقی مضمون ہے (۴۵)۔

اس کے بعد یونیورسٹی کی اعلیٰ سند کے لئے اقبال کی حیات اور تصنیفات پر ایک گراں قدر مقالہ پیش کیا۔ یاں ماریک فارسی زبان و ادب پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان میں فارسی تصنیفات کی تاریخ پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو فارسی اور تاجک ادبیات کی تاریخ مولفہ یاں رپکا (Jan Rypka) اشاعت ۱۹۶۳ء میں شامل ہے (۴۶)۔

پروفیسر یاں ماریک نے کامل بیدنار کے اشتراک سے ۱۹۶۰ء میں اقبال کی منتخب منظومات کا ترجمہ ''مشرق کا پیغام'' کے عنوان سے کیا۔ ان کا ایک مضمون ''محمد اقبال اور پبلو نرودا'' بھی پاکستان ٹائمز لاہور (۲ دسمبر ۱۹۷۷ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

اقبال اور اشتراکی انقلاب کے حوالے سے یاں ماریک کا موقف مبہم اور متضاد ہے اور ''ہے بھی اور نہیں بھی'' کی صورت رکھتا ہے۔ وہ یوں تو کہتے ہیں کہ اقبال ایشیاء کے ان اولین شاعروں میں سے تھے جنہوں نے انقلاب روس کو خوش آمدید کہا تھا اور شعوری طور پر اپنی شاعری میں سرمایہ دار کی ترکیب کو نادار کی ضد (تضاد) کے طور پر استعمال کیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یاں ماریک اس تذبذب کے بھی شکار ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ قیام یورپ کے دوران انہوں نے اشتراکی فکر اور فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا لیکن چونکہ اس مدت میں انہوں نے مغربی فلسفیانہ رجحانات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اشتراکی منشور اور مارکس کی ''سرمایہ'' کو بھی پڑھا ہوگا۔ اس کے بعد دلیل کے طور پر یاں ماریک اقبال کی بعض نظموں میں سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ''خضر راہ'' کے حوالے سے وہ انکشاف کرتے ہیں کہ اس نظم میں وہ مشرق اور مغرب کے مزدوروں کو

اس نئی دنیا کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو کامیاب اشتراکی انقلاب کے بعد طلوع ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی یاں ماریک یہ فیصلہ بھی صادر کر دیتے ہیں کہ اقبال اپنے مذہبی عقائد اور ذہنی ارتقاء کی بدولت حیات و کائنات کے بارے میں اشتراکیت کے مادی نقطہ نظر اور علمی جدلیات کے طریقوں کو قبول نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اکتوبر کے عظیم اشتراکی انقلاب کو خوش آمدید کہا لیکن وہ اس نظام کو نافذ کرنے والے عوامل کا بہت تھوڑا فہم رکھتے تھے[۴۷]۔

ایسی ہی ایک صورتحال کا تجزیہ جگن ناتھ آزاد نے بھی ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ کی تصنیف "Islam In Modern India and Pakistan" کے حوالے سے کیا ہے جس میں اقبال اور اشتراکیت کے حوالے سے اس طرح کی لفاظی ملتی ہے کہ اقبال جذباتی اعتبار سے سوشلسٹ تھے' ذہنی طور پر سوشلسٹ نہیں تھے۔ انہوں نے اشتراکیت کے بارے میں نظمیں بھی کہیں لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انہیں اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ اشتراکیت کیا ہے وغیرہ' ایسی لاحاصل بحث ہے کہ جس سے اقبال کے بارے میں کوئی رہنمائی فراہم نہیں ہو سکتی[۴۸]۔

ان مثالوں کے علاوہ مغرب میں اقبال شناسی کے حوالے سے ایل۔ ایس۔ مے (Iqbal: His life and Times)(L.S.May)' ڈاکٹر ایڈورڈ ایلسن (Dr. Edward Elison)' ڈاکٹر والٹر' ایچ جوڈ (Dr. Walter Judd)' ڈاکٹر ولیم ڈگلس (Dr William Douglas)' ایڈورڈ میکارتھی' پروفیسر نارتھ وپ' وکٹر کیرنن' رابنسن فرانس' آئین سٹیفن' پروفیسر رش بروک کے نام نمایاں ہیں۔

مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ چند ایک معاندانہ مثالوں سے قطع نظر اہل مغرب نے افکار اقبال کے غائر اور سنجیدہ مطالعے کے بعد اپنے خیالات کو قلمبند کرتے ہوئے غیر متعصبانہ رویہ اختیار کیا اور اقبال کو مشرق کے باوقار اور قابل ذکر شعراء اور مفکرین میں ایک ممتاز مقام پر فائز کیا لہٰذا ہم مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کو شاندار قرار دے سکتے ہیں البتہ یہ ناقابل فہم ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے استقبال کو مغربی دنیا میں جو خاص اہمیت دی گئی اور ذرائع ابلاغ نے بیسویں صدی

کی Achievements کے حوالے سے جو خصوصی تحقیقی سلسلے مرتب کئے ان میں اقبال اور افکار اقبال کو یکسر کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اس ضمن میں ہفت روزہ "Time" کی مثال دی جا سکتی ہے جس نے ۱۹۹۹ء کے دوران بیسویں صدی کی اہم مشرقی و مغربی شخصیات کے حوالے سے کئی اہم نمبر شائع کئے (۴۹)۔ خاص طور پر "Time Asia" کی ایک اشاعت کا عنوان ہی "The Most Influential Asians of the 20th Century" ہے جس میں برصغیر کی ادبی شخصیات میں سے رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت اور فن پر دو صفحات کا تجزیہ موجود ہے لیکن اقبال کا کچھ تذکرہ نہیں۔ اس کے محرکات پر بحث ہمارا موضوع نہیں لیکن یہ سوال ضرور ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک صدی پر پھیلی ہوئی اقبال شناسی کی روایت، جس میں مغرب کا بھی قابل قدر حصہ ہے کہیں آج بڑھتے ہوئے عالمی تعصبات اور بدلتی ہوئی ترجیحات کا شکار تو نہیں ہو رہی؟

○

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ہرمین ہیسے نے اقبال کے بارے میں ان خیالات کا اظہار اس مختصر تعارف میں کیا ہے جو انہوں نے ڈاکٹر این میری شمل کے جرمن ترجمہ، ''جاوید نامہ'' کے لئے تحریر کیا۔ اس تعارف کو محمد اکرام چغتائی نے جرمن سے براہ راست اردو میں ترجمہ کیا ہے جو''اقبال کی روحانی اقالیم'' کے عنوان سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے شائع ہونے والے مجموعے''اقبال: مشرق ومغرب کی نظر میں'' میں شامل ہے۔ دیکھئے تخلیق مکرر، ۲۰۰۲ء ص ۲۳۔

۲۔ پروفیسر نکلسن کا انگریزی ترجمہ''اسرار خودی''، ''The Secrets of the Self'' کے عنوان سے میکملن اینڈ کمپنی، لندن سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ لاہور سے شیخ محمد اشرف نے اسے پہلی بار ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ اس کا آٹھواں ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا جو ہمارے پیش نظر ہے۔

۳۔ پروفیسر نکلسن سے متعلق یہ مختصر معلومات، ڈاکٹر سعید اختر درانی کی تصنیف''اقبال یورپ میں''، شائع کردہ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۹۹ء کے ایڈیشن سے اخذ کی گئی ہیں۔ دیکھئے ص ۱۵۴۔

۴۔ Nicholson, R.A, Introduction, The Secrets of the Self , p-xxx

۵۔ اقبال کی توضیحات، ''The Secrets of the Self''

۶۔ تعارف ص ۱۵ سے ۲۸ ۷۔ تعارف ص ۲۹

۸۔ جگن ناتھ آزاد، اقبال مغربی خاور شناسوں کی نظر میں (مضمون) مشمولہ، علامہ اقبال: حیات، فکر وفن، مرتبہ، ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۸۲۰۔

۹۔ جسٹس ایس۔اے رحمٰن، ترجمان خودی (اسرار خودی کا منظوم ترجمہ)، مکتبہ کاروان، لاہور، دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء ص ۹

۱۰۔ مقدمہ، ترجمان خودی، از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ص ۴۸۔

۱۱۔ دیکھیے دیباچہ ''Notes on Iqbal's Israr-i-Khudi'' شائع کردہ شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ دیکھیے سید عبداللہ کا مضمون ''اقبال کے غیر مسلم مداح اور نقاد''، مشمولہ ''اقبال: ممدوح عالم''، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر بزم اقبال، لاہور، نومبر ۱۹۷۸ء، ص ۶، ۷ پر درج حواشی ۱،۲،۳۔ نیز متعلقہ موضوع پر ان کا ایک اور معلوماتی مضمون بعنوان ''اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح''، سہ ماہی صحیفہ، اقبال نمبر (مجلس ترقی ادب لاہور) کی اشاعت اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۲ء میں شامل ہے، جس کے لئے ص ۱ تا ۱۷ دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے غیر مسلم مداح اور نقاد، ص ۷۔

۱۵۔ کلیات مکاتیب اقبال (جلد دوم) مرتبہ، سید مظفر حسین برنی، ترتیب پبلشرز، لاہور ص ۱۶۱۔

۱۶۔ ایضاً ص ۱۶۸۔

۱۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے دائمی اہمیت کے حامل، ہربرٹ ریڈ کے اس مضمون کا اردو ترجمہ ''عظمت اقبال'' کے عنوان سے سب سے پہلے اپنی مرتب تالیف ''اقبال۔ ممدوح عالم، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۸ء میں شامل کیا، دیکھیے ص ۱۱۱، پھر اصل مضمون بزبان انگریزی ڈاکٹر سلیم اختر کے تعارف کے ساتھ ''Iqbal Review'' (اقبال اکادمی پاکستان) لاہور کے شمارے، اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ دیکھیے ص ۳۳ تا ۳۷۔ سال اقبال ۲۰۰۲ء کے حوالے سے شائع ہونے والی ڈاکٹر سلیم اختر کی تصنیف ''اقبال۔ شخصیت، افکار و تصورات۔ مطالعہ کا نیا تناظر''، شائع کردہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء، میں بھی ایک مضمون ''عظمت اقبال کا معترف، ہربرٹ ریڈ'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں ہربرٹ ریڈ کی شخصیت اور ادبی خدمات پر تفصیلی تعارف موجود ہے۔ دیکھیے ص ۳۳۷ تا ۳۴۲ نیز پروفیسر طاہر فاروقی کی ''سیرت اقبال''، میں جو اقبال کی وفات کے فوراً بعد ۱۹۳۸ء میں مکمل ہو کر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔

ہربرٹ ریڈ کا حوالہ یورپ کے ایک منعم اور مستند نقاد کے طور پر موجود ہے جس نے اقبال کو شاندار الفاظ میں یاد کیا ہے۔ دیکھئے ''سیرت اقبال''، ص ۲۵۰۔۲۵۴

۱۸۔ سہ ماہی ''Iqbal Review''، ص ۳۵

۱۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح اور نقاد، ص ۸، ۹۔ اس کے علاوہ پروفیسر آربری کی تصانیف اور تراجم سے متعلق معلومات کے لئے درج ذیل کتب ومقالات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ا۔ ڈاکٹر سلیم اختر (مرتبہ) اقبال: ممدوح عالم، بزم اقبال لاہور ۱۹۷۸ء۔

ب۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اقبال مغربی خاور شناسوں کی نظر میں (مضمون) مشمولہ ''علامہ اقبال حیات، فکر وفن، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳''

ج۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال شخصیت، افکار وتصورات: مطالعہ کا نیا تناظر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴۔

د۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر، علامہ محمد اقبال اور پروفیسر آرتھر جان آربری (مضمون) مشمولہ ''علامہ اقبال اور مسیحی مشاہیر'' مرتبین، منصور گل، ریاض طاہر فل گاسپل اسمبلیز آف پاکستان لاہور ۲۰۰۲ء۔

۲۰۔ آغا افتخار حسین، یورپ میں اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸، ص ۱۱۔

۲۱۔ اطالوی جریدے ''مشرق جدید'' میں شائع ہونے والے ان مضامین کی فہرست، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' میں درج کی ہے۔ دیکھیے ص ۱۶۷

۲۲۔ اقبال: شخصیت، افکار وتصورات، ص ۲۸۳ ۔۔۔ ۲۳۔ اقبال: ممدوح عالم ص ۶۶

۲۴۔ اقبال۔ مغربی خاور شناسوں کی نظر میں، ص ۸۲۵

۲۵۔ ایک اردو ترجمہ، ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے ''اقبال کے فلسفہ اور شاعری میں ابلیس'' کے عنوان سے کیا جو ''اقبال۔ مشرق ومغرب کی نظر میں'' مجلہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکا ہے، دیکھئے ص ۲۵۔

۲۶۔ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، ص ۱۰۵

۲۷۔ "Iqbal Centenary Papers, Vol-I" کو پروفیسر محمد منور نے مرتب کیا اور شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ پروفیسر بوسانی کے اقتباسات کے لئے دیکھئے ص ۲۸، ۳۱۔

۲۸۔ راقم کا مضمون بعنوان 'ممتاز جرمن مستشرق اور اقبال شناس: ڈاکٹر این میری شمل'' مشمولہ تحقیق نامہ، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۴، ص ۱۴۵۔ نیز ڈاکٹر شمل سے متعلق بیشتر معلومات اسی مضمون سے اخذ کی گئی ہیں۔

۲۹۔ ڈاکٹر این میری شمل کی تصانیف اور تحقیقی مقالات کی تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کی طرف سے شائع کردہ "Bibliography" "And Here The Twain Did Meet" ترتیب و تدوین ایم۔ اکرام چغتائی اور محمد سہیل عمر طبع دوم ۲۰۰۳ء۔

ب۔ پاکستان۔ جرمن فورم پاکستان کی طرف سے شائع کردہ تراجم و تحقیقی مقالات کا مجموعہ، "Muhammad Iqbal-Poet And Philosopher"، کراچی ۱۹۶۰ء۔

ج۔ Pakistan Studies News, Spring 2004 Vol-VII ص ۱۷ تا ۲۳۔

۳۰۔ مقدمہ شہپر جبریل (اردو ترجمہ، ڈاکٹر محمد ریاض) گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۔

۳۱۔ Schimmel, Dr. Annemarie, Gabriel's Wing, forward P-VIII

۳۲۔ "Gabriel's Wing" ص ۳۷۷۔

۳۳۔ محمد اکرام چغتائی (مرتبہ) "Iqbal-New Dimensions" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۳۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی فہرست کے مطابق اس کا انگریزی ترجمہ، ملا عبدالحمید ڈار نے "Introduction"

"To The Thought of Iqbal" کے عنوان سے کیا جسے اقبال اکیڈمی کراچی نے ۱۹۶۲ء میں

شائع کیا۔اردو ترجمہ خود ڈاکٹر سلیم اختر نے ''فکر اقبال کا تعارف'' کے عنوان سے کیا جو سنگ میل پبلی کیشنز

نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ دیکھیے اقبال،شخصیت،افکار و تصورات ص ۳۲۱۔

۳۵۔ لوس کلوڈ میتیع،فکر اقبال کی جہات،مشمولہ،اقبال ممدوح عالم،ص ۱۹۳،۱۹۴،۲۰۰تا۲۰۵۔

۳۶۔ مولانا اسلم جیراج پوری کے نام اپنے خط مورخہ ۱۷مئی ۱۹۱۹ء کو اقبال نے لکھا: ''منصور حلاج کا رسالہ

''کتاب الطواسین'' جس کا ذکر ابن حزم کی ''فہرست'' میں ہے،فرانس میں شائع ہوگیا ہے۔مولف

(مسینون) نے فروغ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں''۔کلیات مکاتیب اقبال (جلد دوم)

مرتبہ،مظفر حسین برنی،ص ۵۶۔

۳۷۔ Massignon,L, Preface to the French translation of Iqbal's "Reconstruction of Religious Thought In Islam" by Eva Meyeroviteh (Paris, 1955). The English translation of the preface was made by Dr. Reyazul Hassan, published in the Quarterly "Iqbal", Bazm-e-Iqbal, Lahore, Jan. 1967.

۳۸۔ اقبال:شخصیت و افکار و تصورات ص ۳۴۴۔

۳۹۔ ایس۔اے واحد کے''COMMENTS'' کیلئے دیکھیے''پیش لفظ،فرانسیسی ترجمہ خطبات اقبال''،سہ

ماہی اقبال،جنوری ۱۹۶۷ء،ص ۶۴۔

۴۰۔ خطبات اقبال کے اردو تراجم،تشریحات اور توضیحات کا ایک جائزہ راقم کے ایک مضمون ''خطبات اقبال

کی عصری اہمیت'' میں پیش کیا گیا ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

۴۱۔ ڈاکٹر شیلا میکڈونا کے بارے میں یہ تعارفی سطور سہ ماہی "Iqbal Review" اقبال اکیڈمی کراچی

(اپریل ۱۹۶۱ء) سے لی گئی ہیں۔

۴۲۔ ڈاکٹر شیلا میکڈونا "The Mosque of Cardova: vision or Perish"، سہ ماہی "Iqbal Revies" کراچی (اپریل ۱۹۶۷ء) ص ۴۶، ۴۷۔

۴۳۔ باربرا ڈی مٹکاف "Reflections on Iqbal's Mosque"، مشمولہ Iqbal Centenary Papers، ص ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶۔

۴۴۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی، اقبال یورپ میں، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۹۹ء۔ ص ۳۱۰۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۱۰۔ ۴۶۔ آغا افتخار حسین، یورپ میں اردو ص ۹۱۔

۴۷۔ ژاں ماریک، علامہ اقبال کی شاعری میں سوشلسٹ نظریات (مضمون) مشمولہ ''اقبال۔ مشرق و مغرب کی نظر میں''، ص ۸۰، ۸۲، ۸۶۔

۴۸۔ جگن ناتھ آزاد، اقبال مغربی خاور شناسوں کی نظر میں، ص ۸۲۵، ۸۲۶۔

۴۹۔ دیکھئے ہفت روزہ "Time Asia"، ہانگ کانگ کا شمارہ (اگست ۲۳۔۳۰، ۱۹۹۹ء)۔

O

سوویت یونین میں اقبالیاتی تحقیق

شاید اردو ادب کے عام قاری کے لئے یہ ادراک مشکل ہے کہ سابقہ سوویت یونین (روس) میں بھی مغربی ممالک کی طرح اردو زبان وادب اور بالخصوص اقبالیات سے گہری دلچسپی کی روایت موجود رہی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں شائع ہونے والی روسی دانشوروں کے مطالعہ اقبال پر مبنی ایک کتاب میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ گزشتہ چند برسوں میں سوویت دنیا میں پاکستان اور اس سے متعلق ایک سو پچاس سے زائد کتب اور ایک ہزار سے زائد سائنسی تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں (۱)۔ لیکن مغربی اقبال شناسوں کی طرح ڈاکٹر سخاچوف' نتالیا پری گارینا' پولونسکا یا اور ستے پین ینتس وغیرہم کے نام علمی وادبی حلقوں میں بھی اس طرح معروف نہیں ہیں۔ اس میں روسی حکومتوں کی مخصوص داخلی وخارجی پالیسیوں کے علاوہ خود روسی زبان بھی ایک بنیادی مسئلہ بنی رہی ہے۔ گو کہ ماسکو میں قائم غیر ملکی زبانوں کے اشاعتی ادارے نے عالمی کلاسیکی اور جدید ادب کے علاوہ روس میں ہونے والی مختلف ممالک کی ادبی تخلیقات اور تحقیقات کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے اہم کردار ادا کیا ہے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی اقبال شناسوں کے برعکس روس میں افکار اقبال کو ایک مخصوص تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش نظر آتی ہے جس کی نشاندہی پروفیسر فتح محمد ملک نے بھی کی ہے:

> ''سوویت دانشوروں نے اقبایت کے مطالعے کو ایک نئی پہنائی سے آشنا کیا ہے۔ مغربی مستشرقین اقبال کے فکر و فن پر تصوف کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو روسی دانشور سامراج کے حوالے سے۔ دنیائے مغرب کے بیشتر اقبال

شناس، اقبال کے مخصوص زمان ومکان سے بے نیاز ہو کر مجرد
تصورات کی بھول بھلیوں میں گم ہیں تو اقبال کے سوویت
شارحین اور نقاد سامراج دشمنی اور انقلاب پسندی کو اقبال
کے سوز وساز و درد وداغ وجستجو وآرزو کا سرچشمہ قرار دیتے
ہیں''۔ (۲)

اس مؤقف کا راست اظہار معروف خاور شناس ڈاکٹر سخاچوف نے بھی یہ کہہ کر کیا ہے کہ کلام اقبال اور اس کے بارے میں سوویت دانشوروں کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد قارئین اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ شاعر نے اپنے ہم وطنوں میں یہ جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی کہ وہ ملک کی سیاسی زندگی میں، بلکہ پورے مشرق کی سیاسی زندگی میں دلچسپی لیں اور جہالت اور شر کی تمام طاقتوں کے خلاف مصروف عمل ہو جائیں جس کے نتیجے میں ان کا ملک آزادی کی نعمت سے محروم ہو گیا تھا (۳)۔

اقبال اور انقلاب روس

اقبال نے انقلاب روس (۱۹۱۷ء) کو اس کی بعض خصوصیات خاص طور پر مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی بدولت خوش آئند قرار دیا تھا اور انقلابی رہنماؤں مارکس اور لینن کو اپنی بعض نظموں کا موضوع بھی بنایا۔ اقبال کی نظر انقلاب کے ''لا'' سے شروع ہونے والے سفر پر تھی جس کے بارے میں اس وقت فیصلہ ہونا باقی تھا کہ اس کا اگلا پڑاؤ ''الا'' ہے یا وہ ''لا'' سے ''لا'' کے درمیان ہی میں گردش کرتا رہے گا۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں سوویت یونین کے انہدام کی صورت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا افکار اقبال کی روشنی میں مطالعہ اہم بھی ہے اور فکر انگیز بھی، جس کا تحقیقی جائزہ لیا جانا چاہئے۔

لیکن یوری گنکوونسکی اور دوسرے سوویت سکالرز نے انقلاب ۱۹۱۷ء سے متعلق اقبال کے کلمات تحسین کو پیش نظر رکھا ہے اور اسی پر زور دیتے رہے کہ انصاف پر مبنی سماج کا قیام جو ہر طرح کے استحصال سے پاک ہو، وہ عملی طور پر ممکن ہے۔ اس زمانے کے تمام حق پرست

دانشوروں کی طرح علامہ اقبال نے بھی اس نئے تاریخی تجربے کا‘ جس نے انسان کی غلامی کا خاتمہ کردیا تھا‘ دل سے خیر مقدم کیا[۴]۔

۱۹۱۲ء میں اے۔اے کریمسکی کی ایران کی تاریخ اور ادب کے موضوع پر شائع ہونے والی تحقیقی تصنیف میں اقبال کا تذکرہ محض اس کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء'' کے حوالے سے ہوا جس کے بعد طویل عرصہ تک اقبال اور افکار اقبال کی طرف عدم توجہی اور بیگانگی کا رویہ نظر آتا ہے جس کی مثال ۱۹۵۸ء میں شائع ہونے والا روسی انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں اقبال کا کوئی ذکر موجود نہیں۔۱۹۶۱ء میں گنگووسکی اور گورڈن پولونسکایا کی مرتبہ ''تاریخ پاکستان (۱۹۴۷ء۔۱۹۵۸ء)'' میں بھی پاکستان‘ نظریہ پاکستان اور اقبال کے کردار کو سرکاری نقطۂ نظر کے تحت منفی انداز میں Paint کرنے کی کوشش کی گئی۔

روس میں اقبال شناسی کی روایت کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ تجزیہ درست سمت میں ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ سوویت یونین میں اقبال شناسی ایک مسلسل اور تدریجی ارتقاء کی آئینہ دار ہے اور تقلید و تعصب سے شروع ہونے والا یہ سفر بتدریج اجتہاد اور وسیع النظری کی جانب بڑھتا رہا ہے[۵]۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ گورڈن پولونسکایا نے اپنی تصنیف ''برصغیر کے عمرانی فکر میں مسلمانوں کے رجحانات'' (۱۹۶۳ء) میں اقبال کی ایک مصلح کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی تصنیف ''اسلامی فکر کی نئی تشکیل'' کے حوالے سے لکھا کہ اقبال کی عظیم الشان شعری اور فکری روایت کو ابھی تک کسی شارح کا انتظار ہے[۶]۔

اقبال روسی دانشوروں کی نظر میں

۱۹۸۳ء میں پاکستان میں شائع ہونے والی ایک کتاب "The Work Of Muhammad Iqbal (A collection of Articles by soviet Scholars)" میں چودہ روسی دانشوروں کے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں پر مقالات شامل ہیں جن میں نتالیا پری گارینا‘ وائی چیل شیف‘ روزوسکی‘ ڈاکٹر سخاچوف‘ میریٹا ستے پین ینتس‘ غفاروف اور پولونسکایا قابل ذکر ہیں اور اس سے روس میں اقبال شناسی کے ارتقاء کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

پولونسکا یا

مذکورہ بالا مجموعے میں پولونسکا یا کا ایک مقالہ: اقبال اور انقلاب (Iqbal on the Revolution) بھی شامل ہے جس میں اقبال کے تصور انقلاب کو واضح کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک فقط ایسی سماجی تبدیلیاں ہی انقلاب کا پیش خیمہ ہوسکتی ہیں جن کے ذریعے سے نوآبادیاتی نظام اور سماجی استحصال کا خاتمہ ممکن ہو سکے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اقبال کے آزادی اور سماجی انقلاب کے فلسفے کی بنیاد اسلام کا انقلابی کردار ہے جو شعور میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کا موٗجب بنتا ہے لیکن معاشرے میں یہ تبدیلی اور انقلاب صرف اور صرف انسانی عمل کے ذریعے سے ممکن ہے کیونکہ نہ تو انقلاب آسمان سے اترتا ہے نہ ہی کوئی مسیحا اسے برپا کرتا ہے۔

جب وہ انسانی، معاشرتی اور کائناتی سطح پر ترقی کی بات کرتے ہیں تو وہ ارتقا (Evolution) اور انقلاب (Revolution) کے بارے میں ایک واضح فرق بھی رکھتے ہیں اور جدلیاتی طور پر ان دونوں کو آپس میں متعلق بھی کردیتے ہیں۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک ارتقا کا مطلب ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو معاشرے میں اسلام کے بنیادی اصولوں کے نفاذ کا ذریعہ بنتا ہے جبکہ انقلاب سے مراد اسلامی اصولوں سے متصادم کہنہ روایات کو مکمل طور پر ختم کر کے اسلامی اصولوں کی اساس پر ایک معاشرے کا قیام ہے۔

اقبال، ارتقاء اور انقلاب کو ایک دوسرے سے متصادم قوت کے طور پر نہیں لیتے بلکہ ان کو یقین حاصل ہے کہ معاشرے میں نافذ اجتہادی اسلامی اصول ہی انقلابی تبدیلیوں کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر ایک طرف اقبال کے تصور انقلاب کا مطلب سماجی انصاف کے اصولوں کا احیاء ہے جو ان کے نزدیک ابتدائی دور کے حقیقی اسلام کی روح ہے تو دوسری طرف ان اصولوں کے عملی نفاذ کے لئے ان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا بھی ناگزیر ہے۔ البتہ اس سوال کا اقبال کے پاس کوئی جواب نہیں کہ آیا ایک نیا سماج، ارتقائی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہوگا یا خونی انقلاب کے راستے سے وجود میں آئے گا۔ لیکن اقبال نے جس طرح سے ارتقاء اور انقلاب کو باہم منسلک کیا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاشرتی سطح پر ارتقائی تبدیلیاں ہی انقلابی تبدیلیوں کا موجب بنتی ہیں (۷)۔

میریٹا ستے پین یَنٹس

روس میں اقبال شناسی کے حوالے سے ایک اور قابل ذکر نام، پروفیسر میریٹا ستے پین یَنٹس (Marietta Stepanyants) کا ہے جو ۱۹۳۵ء میں ماسکو میں پیدا ہوئیں۔ مختلف تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۵۹ء میں یو۔ ایس۔ ایس آر اکیڈمی آف سائنسز، ماسکو کے شعبہء فلسفہ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۷۴ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۰ء میں انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی کے مشرقی علوم کے شعبے کی صدر مقرر ہوئیں۔

ان کو اپنے روسی ڈپلومیٹ شوہر کے ساتھ پاکستان میں قیام کا موقع بھی ملا۔ وہ پاکستان فلسفہ کانگریس (۱۹۶۱ء۔ ۱۹۶۴ء)، انڈین فلسفہ کانگریس (۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۸۳ء) کے اجلاسوں میں شرکت کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو کینیڈا، چیکوسلواکیہ، ڈنمارک، یونان، بھارت، اردن، فن لینڈ، ہالینڈ، شمالی کوریا، منگولیا، ویت نام اور امریکہ میں منعقد ہونے والی عالمی سطح کی علمی کانفرنسوں میں بھی شرکت کے مواقع نصیب ہوتے رہے ہیں۔

ان کی اہم تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

1. Pakistan:Philosophy and Sociology (Moscow 1964, Lahore Ed. 1972)
2. Islamic Philosophy In XIX-XX Centuries (Moscow, 1974)
3. Islamic Concepts In Philosophy and Politics (XIX-XX Centuries) (Moscow 1982, Lahore Ed. 1989) With the forward of Prof. Rafi- Ullah Shehab)
4. Philosophical Aspects of Sufism (Moscow-1987)

اور اس کے علاوہ ان کے سو سے زائد تحقیقی مقالات بین الاقوامی سطح کے علمی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب نے "Islamic Philosophy And Social Thought (In 19th & 20th Centuries) کے پاکستانی ایڈیشن کے پیش لفظ میں مصنفہ کے اسلامی افکار کے مطالعہ کو اپنے ملک کے بعض روایتی اور جدید مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء سے زیادہ مکمل قرار دیا ہے اور ساتھ ہی انہیں اس کتاب کے مطالعہ کی تلقین کی ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے کتنی علمی ریاضت درکار ہوتی ہے (۸)۔

ڈاکٹر میریٹا نے اقبال پر جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کے وسیع مطالعے اور عمیق خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے افکار اقبال پر مشرق و مغرب کے مفکرین کے اثرات کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں بعض مغربی اقبال شناسوں کی طرح کوئی حتمی فیصلہ صادر کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا۔

ان کا خیال ہے کہ اقبال نے تصوف کے ایک ناقد ہوتے ہوئے بھی نہ صرف صوفیاء کے فلسفیانہ خیالات سے بہت کچھ اخذ کیا ہے بلکہ بیشتر صوفیانہ اصطلاحات کو استعمال بھی کیا ہے لیکن صوفیاء کے نظریہء وحدت الوجود' جس میں خدا اور فطرت کی ہم آہنگی پر زور دیا جاتا ہے' کی تفسیر روایتی اسلامی تصوف سے بالکل مختلف انداز میں کی ہے۔

تصوف میں ''ظاہر'' اور ''باطن'' (Appearance and Reality) میں فرق پر اصرار نظر آتا ہے جس کے مطابق خدا حقیقت اور فطرت غیر حقیقت یا فریب ہے لہٰذا اس دنیا کے مادی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان بھی حقیقت کے بجائے حقیقت کا عکس ہوتے ہوئے محض الٰہی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ دنیا چونکہ عارضی اور غیر اہم ہے لہٰذا اپنے دیگر مسائل سمیت کسی توجہ کی مستحق قرار نہیں پاتی۔ لیکن اقبال انسان یا انفرادی خودی کو خدا یا کائناتی خودی میں ضم یا فنا کر دینے کی بجائے' جو کہ انسان کے اپنے کردار سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے' خودی کے خدائی تخلیقی عمل میں شریک ہونے کا حامی ہے (۹)۔

وہ بار بار خطبات اقبال Reconstruction of Religious Thought in Islam کے حوالے سے اقبال کے مؤقف کی وضاحت کی کوشش کرتی ہیں کہ انفرادی خودی (Individual Ego) اعلیٰ خودی یا ربانی خودی (Divine Ego) سے قربت کے لئے بے تاب

ہے مگر اقبال کے نزدیک یہ بے تابی فنائے ذات (خودی) کی بجائے استحکام خودی کا ذریعہ بنتی ہے۔اور خودی کو یہ استحکام تین مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ان تینوں مراحل سے جہاں ایک طرف خیال صوفیانہ ''طریقت'' کی طرف مبذول ہوتا ہے' وہیں نطشے کے فوق البشر کے ارتقائی عمل کی یاد بھی دلاتا ہے۔مگر ظاہری مماثلت کے باوصف ان کی نوعیت یکساں نہیں کیونکہ اقبال صوفیاء کے تصور فنا اور نفی ءذات کی بجائے اثبات ذات پر زور دیتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کامل کا مقام حاصل ہوتا ہے جو دنیا میں احکامات الٰہیہ کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔یہ تصور نطشے سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ اس کا فوق البشر کسی اخلاقی نظام کا قائل نہیں جبکہ اقبال کا انسان کامل اپنی ذاتی خواہشات سے بلند ہو کر اپنی صلاحیت اور توانائی کو رضائے الٰہی کے لئے استعمال کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے میں پائے جانے والے شر پر غالب آکر حق کو عام کرنے کے لئے برسر عمل ہوتا ہے[۱۰]۔

اقبال کے تصور انسان کامل کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اسلامی تصوف کی پوری روایت کو ذہن میں رکھا ہے اور پھر اس کا موازنہ ابن عربی اور رومی کے انسان کامل کے ساتھ کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ انسان کامل کا تصور شروع ہی سے صوفیاء کی تعلیمات کا حصہ رہا ہے۔ ابتدائی دور کے صوفیاء نے پیغمبرؐ کو انسان کامل کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس حدیث کا حوالہ دیا جس میں پیغمبرؐ کا فرمان ہے ''خدا نے جو اول شے تخلیق کی وہ میری روح تھی''۔ابن عربی نے پہلی بار ''انسان کامل'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اسے ایک باقاعدہ صوفیانہ نظریے کی صورت میں پیش کیا۔ابن عربی کا انسان کامل ایک سطح پر ایک ایسی مطلق حقیقت ہے جو عالم اصغر ہوتے ہوئے بھی عالم اکبر یعنی وجود مطلق کی تمام صفات کا مظہر ہے۔ابن عربی کی طرح رومی نے بھی عالم اصغر اور عالم اکبر کے تصورات قبول کئے ہیں لیکن ان کی شرح کا انداز مختلف ہے اور انہوں نے ابن عربی سے پہلے کی صوفیانہ روایت کو پیش نظر رکھا ہے۔

رومی کے نزدیک انسان کامل' حقیقت کی تمام سطحوں پر بیک وقت عالم اصغر اور عالم اکبر کی مثال ہے جسے ان کا امتزاج بھی قرار دیا جا سکتا ہے یعنی عالم اصغر انسان کامل کی خارجی صورت ہے جبکہ عالم اکبر اس کا داخلی جوہر ہے۔اقبال نے' جو رومی کو اپنے مرشد کا درجہ دیتے ہیں

اور بیسویں صدی کے تقاضوں کے پیش نظر فکر اسلامی کی تشکیل نو کو نو آبادیاتی استبداد کے خلاف قومی احیاء کی جدوجہد میں ایک روحانی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن عقائد اسلامی کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی اپنی کوششوں میں اقبال نے رومی جیسے صوفی شاعر سے صرف وہی حیات بخش عناصر مستعار لئے ہیں جو ان کے حرکیاتی نقطہء نظر کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔ اقبال نے جس انسان کامل کا تصور پیش کیا ہے وہ بھی ایسا متحرک فرد ہے جو خدا کا سپاہی ہے۔[۱۱]

ستے پین ینتس نے اپنی تحریروں میں معروف پاکستانی اقبال شناسوں جیسے خلیفہ عبدالحکیم' پروفیسر ایم۔ ایم شریف' عبدالحمید کمالی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

نامور اقبال شناس' نتالیا پری گارینا

مریٹا ستے پین ینتس اور دیگر روسی اقبال شناسوں کی کاوشوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس علمی روایت میں نتالیا پری گارینا (Natalia Prigarina) کا نام اور کام روشن تر ہے جس کا اعتراف اس کے ہم وطن ڈاکٹر سخاچوف نے بھی یہ کہہ کر کیا ہے:۔

> ''اقبال کی عظمت پورے طور پر نتالیا پری گارینا کے مضامین میں آشکارہوئی ہے جنہوں نے اپنی ساری علمی سرگرمیاں اور سارا وقت مطالعہء اقبال کے لئے وقف کر دیا ہے''۔[۱۲]

جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفرنامہء روس کے حوالے سے پری گارینا کی اقبال شناسی کے ساتھ لگن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> ''کلام اقبال کے ساتھ پری گارینا کی دلچسپی کا جو عالم ہے وہ میں شاید لفظوں میں بیان نہ کرسکوں۔ ماسکو میں پروفیسر مادام پیودا کے گھر جب پری گارینا نتالیا راقم التحریر سے ملنے آئیں تو کلیات اقبال ان کے ہاتھ میں تھی اور اس محفل میں

کوئی آٹھ نو گھنٹے تک مسلسل اقبال اور فکر وفن اقبال کا ذکر
جاری رہا''۔(۱۳)

نتالیا پری گارینا ۸ مئی ۱۹۳۴ء کو ماسکو میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۵۶ء میں ماسکو یونیورسٹی میں قائم لسانیات کی فیکلٹی کے شعبہ ایران شناسی سے ماہر لسانیات ومستشرق کی حیثیت سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۹ء میں روسی سائنسی اکادمی کے ادارہ شرقیات سے وابستہ ہوگئیں۔ ۱۹۶۷ء میں آپ نے ''محمد اقبال کی فلسفیانہ غنائی شاعری کے چند پہلو (بحوالہ پیام مشرق)'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ غالب اور اقبال ان کی تحقیقی دلچسپی کے خصوصی موضوعات ہیں۔ بین الاقوامی سطح کی متعدد کانفرنسوں میں شرکت کر چکی ہیں۔ متعدد تحقیقی مقالات کے علاوہ اقبالیات پر ان کی باقاعدہ تصانیف میں ''محمد اقبال کی شاعری (۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۴ء)'' اور ''کلام اقبال کی شعریات'' (ماسکو ۱۹۸۷ء) ہیں۔

غالب کے دوصد سالہ یوم ولادت کے موقع پر ۱۹۹۷ء میں ان کی اہم تصنیف ''غالب'' بھی شائع ہو چکی ہے(۱۴)۔

پری گارینا کو دوسروں پر یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ مشرق ومغرب میں اقبال شناسی کے حوالے سے ہونے والی اہم تحقیقات پر اس کی گہری نظر ہے بلکہ اقبال پر لکھتے ہوئے وہ اس کے نوآبادیاتی تناظر کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھتی ہیں۔

وہ پروفیسر نکلسن کے حوالے سے اس حقیقت سے پوری طرح متفق نظر آتی ہیں کہ اقبال تمام عظیم شعراء کی طرح اپنے عہد کا فرد ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد سے آگے ہے۔ وہ ایک ایسا فرد ہے جو اپنے زمانے کے معیارات کو تسلیم نہیں کرتا۔

روسی سکالر نے تاریخی تناظر میں افکار اقبال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اقبال کا موقف نوآبادیاتی ممالک میں پروان چڑھنے والی اس نظریاتی کشمکش کا ایک لازمی نتیجہ ہے جو قومی شعور کی بیداری کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ این انیکیف' پولونسکایا' گنگووسکی' ستے پین ینتس اور دوسرے اقبال شناسوں نے ایک طرف اقبال کے مذہبی' فکری اور سیاسی اور سماجی

نظریات، اخلاقیات اور انسانی شخصیت اور ان کے باہمی تعلق کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور دوسری طرف اس کے عہد کی روایات اور واقعات کو بھی پیش نظر رکھا ہے (۱۵)۔

اقبال کے تصور مرد کامل کو اس کے سیاسی حالات کے ساتھ کامیابی سے مربوط کرتے ہوئے پری گارینا اپنا موقف پیش کرتی ہیں:۔

''اقبال کا مرد کامل وہ نہیں ہے جو آفاق میں گم ہو کر یا روز و شب میں الجھ کر رہ گیا ہے بلکہ مرد کامل تو وہ ہے جس میں آفاق گم ہیں۔صرف روحانی طور پر آزاد فرد ہی صحیح معنوں میں ایک نئی دنیا کا معمار بن سکتا ہے اور اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے تسلسل کے ساتھ روحانی آزادی کو سیاسی آزادی کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ اقبال کی ان نظموں کے موضوعات کی کائناتی سطح اس کی تاریخی آگہی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ اگرچہ اقبال کی زندگی میں اس کا ملک سیاسی طور پر آزادی حاصل نہ کر سکا لیکن اس کے روحانی آزادی کے تصور نے اس کے ملک کی سیاسی آزادی کے حصول میں اہم کردار ادا کیا'' (۱۶)۔

نومبر ۱۹۹۷ء میں بیلجیم میں ''اقبال اور عہد نو'' کے حوالے سے منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں پری گارینا نے "The Problem of Interpretation of Iqbal's Poetry at the end of the 20th Century" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مقالہ پڑھا جس میں نہ صرف مختلف سطحوں پر کلام اقبال کی تشریحی مشکلات کا تجزیہ کیا گیا تھا بلکہ اس روسی اقبال شناس خاتون نے اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ اپنی زندگی ہی میں ''کلاسیک'' کا درجہ پانے والے اقبال کو اپنی شاعری کی بدولت عالمی ادب میں بھی یہ مقام ہمیشہ حاصل رہے گا (۱۷)۔

ممتاز تاجیک شاعر، میر شاکر نے ۱۹۵۸ء میں اقبال کی نظموں کا ایک انتخاب تاجیک

زبان میں شائع کیا تھا جسے بہت سراہا گیا اور وہ انتخاب کئی بار شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نکولائی گلیبوف اور عبداللہ غفاروف جیسے اہم قلمکاروں نے اقبال شناسی کی روایت میں اپنا کردار ادا کیا۔ وسطی ایشیاء کی ریاستوں میں یہ روایت مضبوط تر ہو رہی ہے۔ خاص طور پر اقبال کے فارسی کلام کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے میں تو اقبال سوسائٹی بھی قائم ہو چکی ہے جس کے زیر اہتمام یوم اقبال کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ تاجکستان میں اقبال کے فارسی کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سکولوں میں ہر صبح بچے کلام اقبال سے اپنے دن کا آغاز کرتے ہیں۔ تلاوت کے بعد علامہ اقبال کی نظم ''از خواب گراں خیز'' مل کر پڑھی جاتی ہے ... اور وسط ایشیاء کے مسلمانوں کی بیداری کے لئے اقبال کے انقلابی افکار کی اہمیت کا اقرار کیا جاتا ہے[(۱۸)]۔

O

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عبدالرؤف ملک (مرتبہ) The Work of Muhammad Iqbal, A Collection of Articles By Soviet Scholars پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۸۳ء، ص VIII۔

۲۔ فتح محمد ملک کا مضمون ''سوویٹ یونین میں اقبال شناسی'' ان کے مضامین کے مجموعے ''انداز نظر'' التحریر، لاہور ۱۹۸۰ء میں شامل ہے۔ دیکھیے ص ۴۹۔ ماقبل یہ مضمون ''اقبال: ممدوح عالم'' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر میں بھی شامل ہے۔ دیکھیے ص ۲۳۸ تا ۲۴۶۔

۳۔ ڈاکٹر سخاچوف، روس میں اقبال شناسی کی روایت (مضمون) مشمولہ اقبال ممدوح عالم، ص ۲۴۸۔

۴۔ یوری گنگوو سکی ''اقبال اور سوویت یونین''، مضمون مشمولہ ''احساس'' خصوصی نمبر ۸، جلد ۲، شمارہ ۱۱، ۱۲، ص ۱۱۲۔

۵۔ فتح محمد ملک، سوویٹ یونین میں اقبال شناسی، ص ۱۱۱۔ ۶۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۷۔ ایل۔ پولونسکایا "Iqbal On the Revolution" مشمولہ

"A collection of Articles by Soviet Scholars"، ص ۶۴، ۶۵، ۶۶۔

۸۔ پروفیسر رفیع الدین شہاب، پیش لفظ "Philosophy & Social Thought" پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۸۔

۹۔ ایم۔ٹی ستے پین ینتس، "Problesm of Ethics in Muahmmad Iqbal's Philosophy" مشمولہ Explorations، اقبال صدی شمارہ، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۱۔

۱۰۔ ایضاً ص ۳، ۷۔

۱۱۔ ستے پین ینتس "The Concept of Perfact Man in the Work of Jalal-ud- Din Rumi and Muhammad Iqbal" مشمولہ Articles by Soviet Scholars ص ۱۱۹، ۱۳۴، ۱۳۵۔

۱۲۔ ڈاکٹر سخاچوف، روس میں اقبال شناسی کی روایت، ص ۲۴۹۔

۱۳۔ دیباچہ از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اقبال، شخصیت، افکار و تصورات: مطالعہ کا نیا تناظر، ص ۱۲۔ کم و بیش یہی تفصیلات وہ اپنے سفرنامہ روس ''پشکن کے دیس میں'' شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء میں بھی درج کر چکے ہیں۔ دیکھیے ص ۴۰۔۴۴۔

۱۴۔ نتالیا پری گارینا کی تصنیف ''غالب'' کو محمد اسامہ فاروقی روسی سے براہ راست اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں جسے دانیال، کراچی نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے۔

۱۵۔ نتالیا پری گارینا "The Ethic and the Poetic In Iqbal" مشمولہ "Aricles by Soviet Scholars" ص ۲، ۳۔

۱۶۔ ایضاً ص ۱۴، ۱۵۔

۱۷۔ Iqbal- New Dimensions، ص ۱۸۲۔

۱۸۔ تفصیلات کیلئے دیکھیے سہ ماہی ''اقبالیات'' اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۹ء۔ ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

○

افکار اقبال...... مصر، ترکی، ایران اور دیگر ممالک میں

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے دنیائے عرب میں اقبال کو متعارف کروانے کا سہرا ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے سر باندھا ہے جو پاکستان میں مصر کے پہلے سفیر بھی مقرر ہوئے اور جنہیں اقبال کا پہلا عرب مترجم ہونے کا فخر بھی حاصل ہے[(۱)]۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال کے ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں شرکت کے بعد مصر میں مختصر قیام کے دوران عرب دانشوروں کے ساتھ ملاقات کو عرب ممالک میں اقبال شناسی کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں[(۲)]۔ حالانکہ اسے ایک محدود علمی مجلس میں اقبال کا تعارف کہا جا سکتا ہے، اقبال شناسی کا باقاعدہ آغاز کلام اقبال کے ان عربی تراجم اور مقالات سے ہوا جو ڈاکٹر عزام نے مصر کے مشہو ہفت روزہ ''الرسالہ'' میں شائع کروائے اور ۱۹۳۶ء میں ''اللمعات'' کے عنوان سے ایک مجموعہ کلام مرتب کر کے اقبال کی خدمت میں بطور نذرانہ عقیدت پیش کیا[(۳)]۔

ڈاکٹر اظہر کے مطابق عزام کا یہ مجموعہ نہ صرف فکر اقبال کو عرب قارئین تک پہنچانے کی ایک کامیاب کوشش تھی بلکہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور عباس محمود العقاد ایسے اہل قلم کو اقبالیات کے موضوع پر قلم اٹھانے کا ذریعہ بھی بنا[(۴)]۔

خود مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے عالم اور اقبال شناس بھی، جو اقبال پر عربی میں ''روائع اقبال'' (اردو ترجمہ نقوش اقبال) لکھ چکے ہیں اور جو عرب دنیا میں اقبال شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے، ڈاکٹر عزام کی ان خدمات کے معترف ہیں جو انہوں نے اقبال شناسی کے حوالے سے انجام دی ہیں:

''یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں عزام سا ترجمان ملا'
اقبال کی روح ان کی اس محنت و محبت سے یقیناً بہت مسرور
ہو رہی ہوگی،،(۵)۔

اقبال کا یہ سچا عاشق جو اسے ''شاعر اسلام''، ''شاعر مشرق''، ''شاعر زندگی''، ''شاعر خودی''، ''شاعر بے خودی''، ''شاعر الہام''، ''شاعر حریت'' اور ''شاعر انسانیت'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے (۶)۔ ۱۸۹۴ء میں مصر میں پیدا ہوا جہاں اس کے آبا و اجداد لیبیا سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ قاہرہ یونیورسٹی سے سند فضیلت حاصل کی۔ لندن میں فرائض کی بجا آوری کے دوران لندن یونیورسٹی سے فارسی زبان و ادب میں ایم۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ قاہرہ میں جامعہء فواد اول میں علوم مشرقیہ کے استاد مقرر ہوئے اور فردوسی کے شاہنامہ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ مختلف ممالک میں سفیر کی حیثیت سے تعینات رہے۔ شاہ سعود کی دعوت پر جامعہء ریاض کے بانی وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اسی خدمت کے دوران ۱۹۵۹ء میں انتقال فرمایا (۷)۔

اقبال کی حیات' فلسفیانہ افکار اور شاعری پر ان کی تصنیف ''سیرتہ و شعرہ و فلسفتہ'' (قاہرہ ۱۹۵۲ء) کے علاوہ پیام مشرق' ضرب کلیم' اسرار خودی و رموز بے خودی اور جاوید نامہ کے منتخب حصوں کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

عبدالوہاب عزام کی اقبال اور افکار اقبال کے ساتھ وابستگی ان کے کسی قدر احوال سے عیاں ہے۔ دنیائے عرب میں اہل مصر کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف افکار اقبال کو اپنے دل میں جگہ دی بلکہ عرب دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بلا شبہ اس ضمن میں ڈاکٹر عزام کی کاوشوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے اقبال شناسی کے حوالے سے مصری علماء و مترجمین کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ کلام اقبال کے تقریباً سارے ہی عربی تراجم مصری مترجمین کی کاوشوں کے مرہون منت ہیں جیسے صاوی شعلان نے متفرق کلام کے منظوم ترجمے کئے جو اقبال کے جملہ عربی تراجم میں غالباً سب سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ترجمے ہیں (۸)۔

ڈاکٹر ہاشمی نے عام پبلک میں ایک محبوب ہستی کی حیثیت سے اقبال کی شہرت کا ایک بڑا

سبب ام کلثوم مرحومہ کے گائے ہوئے نغمہ ''حدیث الروح'' کوقرار دیا ہے جو ''شکوہ'' کا منظوم ترجمہ ہے جوصادی شعلان نے اس خوبصورت طریقے سے کیا ہے کہ طبع زادعربی نظم کا گماں گزرتا ہے [۹]۔

ڈاکٹر حسین مجیب المصری نے ''جاوید نامہ'' اور ''ارمغان حجاز'' (فارسی حصہ) کے منظوم تراجم کئے جو قاہرہ سے بالترتیب ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئے جبکہ جامعہ ء قاہرہ کے استاد ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم نے ''ارمغان حجاز'' کا نثری ترجمہ کیا۔

محمد حسین الاعظمی' ڈاکٹر نجیب الکیلانی' الصادی شعلان کی مطالعہ ء اقبال پر مبنی کتب کے علاوہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین' ڈاکٹر الخشاب' پروفیسر صالح جودت' یوسف الصباعی اور ڈاکٹر محمد عبدالقادر حاتم کے مقالات میں حیات وافکار اقبال کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے ایک مضمون کا عنوان ہے:

''اقبال (ایک شاعر جس نے زمانے پر اپنا سکہ بٹھا دیا) [۱۰] جس میں اس نے اقبال کا موازنہ عرب شاعر ابوالعلاء المعری (۹۷۳ ـ ۱۰۵۷) کے ساتھ کرتے ہوئے ان کے افکار میں پائی جانے والی مماثلت اور مغائرت کی وضاحت کی ہے۔ دونوں شاعروں نے فلسفہ و شعر میں تطبیق کی کوشش کی۔ دونوں نے تصوف کو اپنایا بھی اور اس کے بعض پہلوؤں پر زبردست تنقید بھی کی البتہ دونوں نے عرفان ذات پر زور دیا اور ہر ایسے نظریئے کی نفی کی جو ذات کی نفی کا درس دیتا ہو۔ طٰہٰ حسین یہ فیصلہ بھی صادر کرتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں ان دونوں شاعروں کا کوئی مثیل نہیں ملتا۔ اور مضمون کے آخری حصے میں وہ عبدالوہاب عزام کی تحسین کرتا ہے کہ جن کی بدولت اسے افکار اقبال کی بلندیوں سے آشنا ہونے کا موقع نصیب ہوا [۱۱]۔

ڈاکٹر عزام ہی کے ایک تربیت یافتہ شاگرد ڈاکٹر یحیٰی الخشاب ہیں جن کا تعلق بھی جامعہ ء قاہرہ سے رہا ہے۔ وہ بھی اقبال کو ایک ایسے عظیم شاعر' فلسفی اور رہنما کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جس نے کسی دنیاوی غرض وغایت کے لئے سیاست میں شمولیت اختیار نہیں کی بلکہ اس کے پیش نظر ایسا برصغیر میں مسلم تشخص کے تحفظ کے لئے ضروری اقدام کے طور پر کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر الخشاب کے خیال میں اقبال ایک ایسے معلم، مفکر ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ اسلام کی تاریخ، سیاست، ثقافت، ادب اور قانون کے مطالعے کے لئے وقف کیا تھا جس کے نتیجے میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کو پالیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلامی تاریخ میں مسلم معاشرے کے زوال کے اصل ذمہ دار وہ حکمران بادشاہ تھے جن کی ساری تگ و دو صرف اپنے اقتدار اور اس سے متعلقہ مفادات تک محدود تھی اور انہوں نے اپنے مفلوک الحال عوام کی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا(۱۲)۔

ممالک اسلامیہ میں یوم اقبال کے سلسلہ میں منعقدہ مختلف تقاریب میں انڈونیشیا کے محمد ناتصر، ڈاکٹر بہادر جوہان، مصر کے ڈاکٹر عبدالقادر حاتم، یوسف الصباعی، پروفیسر صالح جودت اور تیونس کے پروفیسر آئی ایس فہد اور ڈاکٹر احمد خالد کے خیالات شائع ہو چکے ہیں(۱۳)۔

بعض عرب ممالک میں اقبال شناسی کے حوالے سے انفرادی سطح پر کئے جانے والے کام کی مثالیں تو ملتی ہیں لیکن وہ مصر کی طرح کسی مستحکم علمی روایت کا حصہ نہیں بن سکی ہیں۔ ڈاکٹر ہاشمی سعودی عرب کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہاں کے بعض حلقوں میں قدامت پرست علماء کے زیر اثر انگریزی خطبات میں پیش کئے جانے والے خیالات کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے(۱۴)۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسی بات کو زیادہ کھل کر بیان کیا ہے اور ریاض میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کا حوالہ دیا ہے جس میں خطبات اقبال پر سخت تنقید کی گئی اور اسے ''کفریات'' کا مجموعہ قرار دیا گیا تھا(۱۵)۔

ظاہر ہے کہ اقبال ایسے مفکر اور مدبر کے خیالات آزاد علمی ماحول میں ہی عام ہو سکتے ہیں اور ایسا آزاد علمی ماحول ایک مستحکم جمہوری معاشرے ہی میں ممکن ہے۔

ترکی

جدید ترکی اور ترکوں سے اقبال کی وابستگی ان کے کلام میں بار بار ظاہر ہوئی ہے جس کے اسباب کو تاریخی طور پر کئی طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ اقبال کی حریت پسندی ہے جو انہیں ترکوں کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے بھی اس کی

نشاندہی کی ہے:۔

''اقبال کو سدا کے آزاد ترکوں سے ایسی محبت رہی جو عقیدت سے مماثل ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں اقبال کے کلام میں ترک کا ذکر ہوتا ہے' اس کے ساتھ ''حر''، ''محتشم''، ''رعنا'' اور ''سخت کوش'' کی صفات بھی استعمال ہوئی ہیں''(۱۶)۔

''خطبات'' میں ترک رہنماؤں' ضیاء گوک آلپ' محمد عاکف اور اتاترک کے حوالے ملتے ہیں۔ خاص طور پر خطبہ اجتہاد (Principle of Movement in the Structure of Islam) میں اقبال نے ترکی میں انقلاب کے بعد اتاترک کے انقلابی اقدامات اور عالم اسلام پر اس کے اثرات پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے مگر ذیل میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا:۔

''دراصل یہ صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صرف ترک ہیں جنہوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالم حقیقت میں آ گئے ہیں''(۱۷)۔

تیسری علامہ اقبال بین الاقوامی کانگریس منعقدہ لاہور (۹ نومبر تا ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء) میں ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے ''محمد اقبال اور ترک نوجوان'' کے عنوان سے پڑھے گئے اپنے پیپر میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ جتنی محبت اور عقیدت اقبال کو ترکوں سے تھی کیا اتنی ہی محبت ترکوں نے بھی اقبال کے ساتھ کی ہے(۱۸)۔ یقیناً اس کا جواب ''ہاں'' میں ہوگا اور اس کا ثبوت ترکی میں اقبال شناسی کی وہ مستحکم روایت ہے جس میں ترکی کے قومی شاعر محمد عاکف (Mehmet Akif) کے علاوہ ڈاکٹر علی نہاد تارلان' ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان' یوسف صالح' حسین پرویز حاتمی' علی گنجیلی' ڈاکٹر احمد اسرار' صوفی حوری' پروفیسر ترکمن اور کئی دوسرے لکھنے والے شامل ہیں۔

محمد عاکف

محمد عاکف (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۳۶ء) اقبال کے ہم عصر، ہم خیال اور مداح ہیں۔ وہ جدید ترکی کے عظیم المرتبت شاعر اور ترکی کے ملی ترانے کے خالق بھی ہیں۔ انہوں نے سات کتابوں پر مشتمل اپنا مجموعہ ''صفحات'' اقبال کی نذر کیا تھا۔

ان دونوں عظیم شعراء کے درمیان خط و کتابت بھی جاری رہی۔ عاکف کی اقبال کے ساتھ عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کو ''عصر حاضر کا رومی'' کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح وہ اقبال کو جانتے، سمجھتے اور چاہتے ہیں، ان کے احباب بھی اقبال سے ویسی ہی آشنائی پیدا کریں۔ انہیں جہاں موقع ملتا وہ اقبال کی کوئی نظم یا شعر پڑھ کر اس پر گفتگو کرتے تھے[۱۹]۔

ڈاکٹر علی نہاد تارلان

بعض روایات کے مطابق ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بھی محمد عاکف ہی کی بدولت اقبال سے آشنا ہوئے[۲۰]۔ یہ عاکف کی اقبال دوستی ہی کے اثرات تھے کہ ڈاکٹر علی نہاد تارلان (Dr. Ali Nihat Tarlan) جیسی شخصیت اس روایت علمی کو میسر آئی جس نے اقبال کے فارسی کلام کے تراجم کے ذریعہ سے اقبال کے نام اور کام کو پورے ترکی میں روشناس کرایا۔ ان کے تراجم کی فہرست میں پیام مشرق (۱۹۵۶ء استنبول)، گلشن راز . مد ۱۹۵۹ء)، اسرار و رموز (۱۹۶۴ء)، ارمغان حجاز (۱۹۶۸ء)، ضرب کلیم ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر عرفانی کے فارسی ترجمہ سے کیا)، انتخاب زبور عجم (۱۹۶۴ء)، مسافر، اے اقوام شرق اور بندگی نامہ کا ترجمہ (۱۹۷۶ء) شامل ہیں۔

ڈاکٹر تارلان جیسا ممتاز اقبال شناس، پ ستان کے ملی شاعر اقبال کو ترکی کے منور جوار میں روشناس کرانے کو اپنی زندگی کے شمار کئے جانے والے مظاہر میں سے ایک قرار دیتا ہے اور انہی خدمات کی بدولت حکومت پاکستان، ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر تارلان کو ''نشان پاکستان'' سے سرفراز کرتی ہے[۲۱]۔

ڈاکٹر تارلان کا کہنا ہے کہ اقبال نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی غلامی پر مضطرب نظر آتا ہے بلکہ وہ اس ملت ترک کے لئے بھی نوحہ خواں ہے جس نے مرکزی یورپ سے لے کر ایشیاء اور افریقہ تک اسلام کے ہزاروں بلند اور مقدس پرچم لہرائے لیکن جو اس صدی کے آغاز میں ہزیمت کا شکار ہوئی (۲۲)۔

پروفیسر عبدالقادر قرہ خان

ڈاکٹر علی نہاد تارلان کے بعد جس شخصیت کا نام لیا جاسکتا ہے وہ پروفیسر عبدالقادر قرہ خان ہیں جنہوں نے ''ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کی تصانیف سے انتخابات'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو استنبول سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر قرہ خاں نے کتاب کے سرآغاز میں لکھا ہے کہ محمد اقبال پوری دنیا کے ان مسلمانوں اور انسانوں کی خدمت کر چکے ہیں جو حریت' خودمختاری' انسانیت اور بلند خیالی کے پیاسے تھے۔ انہوں نے اپنے اشعار سے بے کسوں' مظلوموں اور غلامی سے کچلے جانے والوں کے لئے بے کنار امید' اور عشق الٰہی کی ندی سے شراب الفت مہیا کی (۲۳)۔

معروف جرمن مستشرق اور اقبال شناس' ڈاکٹر این میری شمل ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۹ء تک انقرہ یونیورسٹی کے شعبہء الہیات سے وابستہ رہیں۔ اسی دوران میں انہوں نے ۱۹۵۹ء میں ''جاوید نامہ'' کا ترکی زبان میں شرح کے ساتھ نثری ترجمہ کیا جو ترکی میں مطالعہ اقبال کے سلسلے کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ڈاکٹر شمل نے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی تحریر کیا جس میں اقبال کے فکری ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے مشرق و مغرب کے بعض مفکرین کے اثرات کی نشاندہی بھی کی۔ اقبال اور محمد عاکف کی شاعری میں پائی جانے والی بعض مماثلتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور اقبال نے مسائل خودی کو جس اثباتی انداز میں بیان کیا اس کا بھی بڑی دقت نظری سے جائزہ لیا ہے۔ اس مقدمے کا اہم حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر شمل نے جدید ترکی کے بارے میں اقبال کے خیالات کو غلط فہمی پر مبنی قرار دیتے ہوئے یہ وضاحت پیش کی ہے کہ چونکہ اقبال ترکی کو نزدیک سے نہ دیکھ سکے، اس لیے وہ اتاترک کے انقلاب کو نہ سمجھ سکے۔ یہ انقلابات پسماندہ تعصب پسند گروہوں

کے خلاف تھے اور یہ مغرب کی اندھادھند تقلید کا نتیجہ نہیں تھے (۲۴)۔

خطباتِ اقبال (Reconstruction of Religious Thought in Islam) کا ایک ترجمہ، عمر رضا دوغرول نے (۱۶۹۳ء) اور صوفی حوری نے (۱۹۶۴ء) میں کیا۔ مولانا ابوالحسن ندوی کی عربی تصنیف ''روائع اقبال'' کا بھی ترکی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایران

اردو کے علاوہ اقبال کی شاعری کی زبان فارسی بھی ہے جبکہ مولانا روم ان کے مرشد ہیں جن کی مثنوی آخر حیات تک ان کے زیرِ مطالعہ رہی اور ان کے فکری ارتقاء میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اقبال کے ڈاکٹریٹ کا موضوع: ''Development of Metaphysics in Persia'' بھی اقبال کی اہلِ فارس سے دلچسپی کا ثبوت ہے جس کے چھ ابواب میں انہوں نے فلسفہ عجم کے ارتقاء کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے جسے خود اقبال نے جدید فلسفیانہ اصطلاحات میں ایرانی تفکر کے منطقی تسلسل کی جستجو سے تعبیر کیا ہے (۲۵)۔

اقبال کی شاعری میں ایرانی شعراء وصوفیاء کے کثرت سے حوالے آئے ہیں جن میں رومی، سعدی، غزالی، فردوسی، سینا، خیام، فارابی، رازی، طوسی، نظامی، عطار، سنائی، خاقانی اور دیگر شخصیات شامل ہیں۔ اسی طرح ایرانی اہلِ قلم نے بھی، جن میں محیط طباطبائی، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی، آقائے سعید نفیسی، احمد علی رجائی، ضیاء الدین سخاوی، عبدالحسین زری کوکب، غلام رضا سعیدی، حسین خطیبی، ڈاکٹر علی شریعتی، قائدین انقلاب ایران بالخصوص آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای اور سینکڑوں دوسرے عظمتِ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں شامل ہیں جس کو دیکھتے ہوئے ہم ایران میں اقبال شناسی کی روایت کو بے مثال قرار دے سکتے ہیں گو کہ دوسرے ممالک اسلامی کے مقابلے میں ایران میں اس کا آغاز تاخیر سے ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایران سے پہلے، اقبال افغانستان میں ایک ادبی مجلّہ ''کابل'' کے ذریعے

سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ اقبال کا دورۂ افغانستان (اکتوبر، نومبر ۱۹۳۳ء) بھی ہو سکتا ہے جس کے دوران میں اقبال نے افغانستان کے شعراء اور دانشوروں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ چنانچہ افغانستان ہی کے ایک شاعر سرور خاں گویا، جو بعد میں مشیر تعلیم، افغانستان بھی رہے، اقبال سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ خود بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں:

> ''یہ امر میری زندگانی کے فخر و مباہات میں سے ہے کہ وہ (اقبال) جتنے دنوں کابل، غزنہ اور قندھار میں ٹھہرا ہے، اس کی صحبت اور ہمراہی کا شرف میرے نصیب میں رہا۔ یہ دوستی اور دل رسی کا رشتہ اس کے آخری دن تک قائم رہا۔ چنانچہ اس کے گراں قدر مکتوبات جو میرے پاس محفوظ ہیں، اس تعلق باہمی کا روشن ثبوت ہیں''[۲۶]۔

مجلّہ ''کابل'' میں ۱۹۳۱ء سے اقبال کا کلام چھپتا رہا، شاید اسی لیے ایک مدت تک اقبال کو افغانستان ہی کا شاعر سمجھا جاتا رہا۔ اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) پر تہران کے ایک ہفت روزہ رسالے نے ان کا صرف ایک قطعہ رسالہ ''کابل'' کے حوالے سے شائع کیا۔ سید محیط طباطبائی بھی جو سرور خاں گویا کی وساطت سے ہی اقبال سے متعارف ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مقام حیرت ہے کہ اہل ایران، پاکستان کے اس فارسی گو شاعر سے یورپ میں مستشرقین کے ہاں اس کی شاعری اور افکار کی اشاعت کے بہت بعد آشنا ہوئے۔ اقبال کی شہرہ آفاق تصنیف ''اسرار خودی'' کا انگلستان میں انگریزی ترجمہ اس کے فارسی متن کے ایران میں شائع ہونے سے پہلے قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گیا تھا اور انگریزی کی اس عارفانہ تصنیف تک رسائی، شاعر کے ''ہم سخن'' اور ''ہم زبان'' ایرانیوں سے پہلے ہوئی''[۲۷]۔

سید طباطبائی کو اس بات کا بھی قلق ہے کہ اس وقت اہل ایران کی اقبال سے ناواقفیت کا یہ حال تھا کہ فردوسی طوسی کے ہزار سالہ جشن ولادت کے منتظمین کو اس بات کا خیال تک نہ آیا کہ برصغیر ہندو پاک میں ایک ایسی عظیم شخصیت بھی موجود ہے جو ایسے جشن میں شرکت کے لیے تمام مشرقی شخصیات میں سب سے زیادہ استحقاق رکھتی ہے (۲۸)۔ یاد رہے کہ اس جشن فردوسی میں برصغیر کی نمائندگی کے لیے ٹیگور کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں سید محیط طباطبائی نے اپنے ادبی مجلّہ ''محیط'' کا اقبال نمبر شائع کیا۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای

مارچ ۱۹۸۶ء میں تہران یونیورسٹی میں علامہ اقبال بین الاقوامی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے، رہبرِ انقلاب اور اس وقت صدر اسلامی جمہوریہ ایران کے عہدۂ جلیلہ پر فائز، آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے اقبال کو مشرق کا بلند ستارہ قرار دیتے ہوئے شاندار الفاظ میں ہدیہ عقیدت پیش کیا اور ساتھ ہی اس امر پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ:۔

> ''ہمارے عوام جو دنیا میں اقبال کے پہلے مخاطب تھے، افسوس کہ وہ دیر کے بعد اس سے آگاہ ہوئے۔ ہمارے ملک کی خاص صورت حال، خصوصاً اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے محبوب ملک ایران میں منحوس استعماری سیاست کا غلبہ اس امر کا باعث بنا کہ وہ کبھی ایران نہ آئے۔ سالہا سال تک ان کی کتابیں ایران میں شائع نہ ہوئیں۔ اقبال کا کوئی شعر اور کوئی تصنیف مجالس و محافل میں عوام کے سامنے نہ لائی گئی'' (۲۹)۔

ایران میں اقبال شناسی کی روایت میں تاخیر کے اسباب خواہ کچھ بھی کیوں نہ رہے ہوں، حقیقی معنوں میں قیام پاکستان کے بعد اس روایت میں برگ و بار پھوٹے اور اس تاخیر کا مداوا اہل ایران نے کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ اقبال اب ان کے لیے

قومی شاعر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور پاکستان کی طرح ایران میں بھی ہر سال یوم اقبال خاص اہتمام سے منایا جاتا ہے۔

اقبال کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ ان کی شاعری اور فلسفیانہ افکار پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ تہران میں پی ایچ۔ ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ نامور شعراء صادق سرمد' ڈاکٹر رضا زادہ شفق' احمد گلچیں معانی' علی اصغر حکمت' قاسم رسا اقبال کو منظوم خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔

برصغیر میں استعماری قوتوں کی پالیسیوں کے نتیجے میں فارسی کی علمی حیثیت پر زبردست زد پڑی تھی۔ اقبال نے فارسی کو اپنے شاعرانہ اظہار کا اس وقت ذریعہ بنایا جب بقول ڈاکٹر صدیق شبلی' فارسی کے اقتدار کا چراغ گُل ہو چکا تھا اور اقبال کی عظیم فارسی شاعری کے ہاتھوں برصغیر میں فارسی زبان کی عمر کچھ اور طویل ہو گئی (۳۰)۔

سبکِ اقبال

فارسی شاعری کے اسالیب کی روایت میں سبک خراسانی' سبک عراقی اور سبک ہندی رائج تھے لیکن اقبال نے ان میں سے کسی سکول کی کورانہ تقلید سے گریز کیا اور اپنی فارسی شاعری کے لئے ایک دلکش اور نیا پیراہن تیار کیا۔ اہل ایران نے اقبال کے اس نئے شعری اسلوب کو ''سبک اقبال'' کا نام دیا۔ اقبال نے اس تخلیقی ایجاد کے ذریعے فارسی شعر کو نئی عظمتوں سے روشناس کیا۔

ڈاکٹر غلام حسین یوسفی

ڈاکٹر غلام حسین یوسفی نے اہل ایران کے دلوں میں اقبال کے لئے پائے جانے والے احترام کے جذبات کا تجزیہ کرتے ہوئے خاص طور پر اس کی دو وجوہ کا ذکر کیا ہے جن میں ایک تو یہ ہے کہ اقبال نے فارسی زبان کے ساتھ اپنی وابستگی کے ذریعے برصغیر میں اس زبان کو ایک نئی وسعت اور رونق بخشی اور دوسرے یہ کہ اقبال نے جب بھی فکر و عمل کی اصلاح کی خاطر

کوئی نئی اور موثر بات کہی تو ان کی توجہ کسی مخصوص سرزمین تک محدود نہ رہی بلکہ انہوں نے عام طور پر مسلمانانِ عالم کو خطاب کیا یا عالم انسانی کو (۳۱)۔

اقبال اور شریعتی

ایران کے انقلابی مفکر اور اقبال کے شیدائی' ڈاکٹر علی شریعتی تہران کے جس مرکز علمی ''حسینیہ ارشاد'' میں اپنے خطبات کے ذریعے نوجوانوں کو انقلاب کے لئے تیار کر رہے تھے' اس کی چھتوں پر بھی اقبال کے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ ایران میں شاہ کے خلاف انقلابی جدوجہد کے دوران بھی مختلف اجتماعات میں آیت اللہ خمینی کی تصویر کے ساتھ ساتھ جمال الدین افغانی (جسے ایران میں اسد آبادی کہا جاتا ہے) اور اقبال کی تصاویر بھی آویزاں نظر آئیں۔

نوجوان نسل پر افکار اقبال کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید عشرت نے لکھا ہے کہ: ''اقبال پوری فارسی شاعری میں انقلاب کا نغمہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت کے خلاف جنگ میں ایران کے انقلابیوں کی قیادت حافظ و سعدی و نظیری نے نہیں کی بلکہ اقبال کے سرمدی نغماتِ انقلاب نے کی ہے'' (۳۲)۔

فلسفہء اقبال کے تحرک اور انقلاب آفرینی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں برطانوی امپریلزم کے عہد میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا لائحہ عمل مرتب کر کے ایک منجمد اور مضمحل قوم کو جدوجہد کا راستہ دکھایا۔ ان کی وفات کے بعد بھی' ان کے زندہ افکار کے ذریعے سے ایک قوم کو وہ رہنمائی نصیب ہوئی کہ جس کے نتیجے میں ڈھائی ہزار سالہ پہلوی شہنشاہیت کی غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ اہل ایران کی اقبال کے ساتھ سچی وابستگی کا نتیجہ تھا کہ ان کو ڈاکٹر علی شریعتی جیسا مفکر اور مفسرِ اقبال نصیب ہوا جس نے نغماتِ اقبال کو ایک پُر سوز اور پُر جوش لحن کے ساتھ اپنی قوم کے سینوں کی دھڑکنوں میں بسا دیا۔ بلاشبہ ڈاکٹر علی شریعتی اقبال شناسی کی روایت کا ایک روشن باب ہیں۔

علی شریعتی ۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء میں صوبہ خراسان میں دشتِ کویر کے کنارے آباد ایک گاؤں مزینان کے ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اپنے کمالاتِ علمی کی بدولت

تہران‘ مشہد‘ اصفہان اور نجف کی ایک معروف علمی شخصیت تھے۔ والد محمد تقی بلند پایہ عالم اور مفسرِ قرآن تھے۔ شریعتی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ شاید اسی لئے مختار مسعود نے لکھا ہے کہ ’’استاد محمد تقی شریعتی کے ساتھ علی شریعتی کے کئی رشتے تھے۔ فرزندی‘ شاگردی‘ مریدی‘ عاشقی،،(۳۳)۔ فرزندی اور شاگردی کے بعد دوسرے رشتوں کی معنویت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب ۱۹۵۶ء میں شاہ کے خلاف مزاحمتی تحریک میں شمولیت کی بناء پر باپ بیٹا دونوں تہران کی ایک بدنام زمانہ جیل میں ساواک کے تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔

مشہد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج سے دو سالہ کورس کی تکمیل کے بعد مشہد کے اطراف میں واقع احمد آباد کے گاؤں میں معلم مقرر ہوئے اور تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ کی۔ شریعتی نے پہلی کتاب اپنے ہیرو‘ حضرت ابوذر غفاری پر قلمبند کی جس میں وہ حضرت ابوذر کو ’’اولین خدا پرست سوشلسٹ‘‘ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مزید تعلیم کے لئے وہ مشہد یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور ۱۹۵۶ء میں ادبیات میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ اسی دوران ان کے دل میں اپنی ایک ہم درس‘ ڈاکٹر پوران شریعت رضوی کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہو گئے اور بالآخر دونوں رشتہء ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

اسی زمانے میں انہوں نے آیت اللہ طالقانی‘ ڈاکٹر سحابی اور مہدی بازرگان کی قوجی تحریک میں شمولیت اختیار کی اور گرفتار بھی ہوئے۔

مشہد یونیورسٹی کے سینٹ نے ان کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ کی منظوری دی اور شاہ کی حکومت نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً ان کو فرانس جانے کی اجازت دے دی جہاں انہوں نے جامعہ شناسی (سوشیالوجی) کے شعبہ میں داخلہ لے لیا۔

وہ فرانس میں قائم ’’سازمان انقلابی جوانان ملی‘‘ کی انقلابی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الجزائر کے نہتے عوام‘ فرانسیسی استعماریت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ شریعتی اپنی حریت پسندی کے سبب براہ راست آزادی کی اس جنگ میں شامل ہو گئے اور اس طرح ان کو فرانز فینن‘ حواری بومدین اور بن بیلا جیسے انقلابیوں سے آشنا

ہونے اوران کے قریب رہنے کا موقع مل گیا۔ وہ فینن سے زیادہ متاثر ہوئے اور جلد ہی اس کے دوست بھی بن گئے۔ انہوں نے فینن کی معروف تصنیف "Le demnes de la lerre" (فرانس ۱۹۶۱ء) کو جسے انقلابیوں کی انجیل قرار دیا جاتا ہے' اور جس کا دیباچہ وجودی فلسفی ژاں پال سارتر نے تحریر کیا تھا'' دوزخیانِ زمین'' کے عنوان سے فارسی میں ترجمہ کیا (۳۴)۔

یہ زمانہ شریعتی کے فکری ارتقاء کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کو ساربون یونیورسٹی میں عمرانیات کے شہرت یافتہ اساتذہ لوئی ماسینون اور گوروتیچ سے استفادہ کا موقع ملا۔ ژاں پال سارتر' شوارنز اور جان کوکتو جیسے دانشوروں کی صحبتوں سے مستفید ہونے کے مواقع ملے۔ ساتھ ہی ساتھ افریقی انقلابی عمراوزغان (صاحب افضل الجہاد) کے افکار و نظریات سے روشناس ہونا نصیب ہوا۔

۱۹۶۴ء میں عمرانیات اور تاریخ مذاہب میں ڈاکٹریٹ کی دوڈگریاں حاصل کر کے وطن واپس پہنچے اور فوراً بعد ہی زنداں میں دھکیل دیئے گئے کہ وہ فرانس میں قیام کے دوران شاہ مخالف سرگرمیوں میں ملوث رہے تھے۔ فرانس کے علمی وادبی حلقوں کے شدید احتجاج پر آخر آپ کو رہا کرنا پڑا جس کے بعد کچھ عرصہ مشہد کے مضافات میں واقعہ ایک مقام ''فردوس'' میں معلم کی حیثیت سے فرائض ادا کیے لیکن جلد ہی مشہد یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو گیا۔ ۱۹۷۰ء سے انہوں نے حسینیہ ارشاد میں بھی اپنے خطبات کا آغاز کیا۔ یہی وہ دور تھا جب انہوں نے عظیم اجتماعات کے سامنے بالخصوص تاریخ، اسلام، فلسفہ، مذہب اور مغرب زدگی جیسے موضوعات پر فکر انگیز لیکچرز دیئے جس سے ان کی مقبولیت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جسے شاہ کے اقتدار کے لئے خطرہ تصور کیا گیا۔ شاہ کی خفیہ پولیس ''ساواک'' حرکت میں آئی، حسینیہ ارشاد میں تالے ڈال دیئے گئے اور شریعتی ایک بار پھر اٹھارہ ماہ کے لئے قید کر دیئے گئے۔ الجزائر کے صدر حواری بومدین نے ان کی جیل سے رہائی کے لئے ذاتی طور پر کوششیں کیں۔ ان کو جیل سے نکال کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ۱۹۷۷ء میں لندن منتقل ہو گئے جہاں ساواک کے ایجنٹوں نے ان کا تعاقب جاری رکھا۔ ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو پراسرار حالات میں شریعتی شہید کر دیئے گئے۔ ایران میں ان کی تدفین کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے ان کو دمشق کے قبرستان، زینبیہ میں سپرد

خاک کردیا گیا[۳۵]۔

ان کی بیشتر تصانیف جیسے:۔

اسلام شناسی، تاریخ مذاہب، مغربی ثقافت کی پہچان، اسلام کی طرف واپسی، قرآن کی طرف واپسی، فاطمہ فاطمہ ہے، انسان، اسلام اور مغربی مکاتیب فکر، چہار زندان انسان وغیرہ ان کے وہ خطبات ہیں جو انہوں نے حسینیہ ارشاد اور دوسری جامعات کے اجتماعات میں ارشاد فرمائے۔

فکر اقبال کے موضوع پر ان کی دو تحریریں:

۱۔ ما و اقبال ۲۔ علامہ اقبال (مصلح قرن آخر)

دراصل حسینیہ ارشاد میں دیئے گئے لیکچرز پر مبنی ہیں جو تہران سے شائع ہوئیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں[۳۶]۔

اقبال اور شریعتی کے حالات میں کئی باتیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں نے جن معاشروں میں آنکھ کھولی وہ اپنی اساس سے محروم ہو چکے تھے۔ ایک برطانوی امپریلزم کے استحصال کا شکار تھا تو دوسرا پہلوی شہنشاہیت کے استبداد میں جکڑا ہوا تھا۔ دونوں مفکرین کو حالات کی ستمگری کا شدید احساس تھا۔ دونوں نے مغرب کی درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اقبال نے انگلستان اور میونخ (جرمنی) کی یونیورسٹیوں سے قانون اور فلسفہ میں ڈگریاں حاصل کیں جبکہ شریعتی ساربوں (فرانس) سے سوشیالوجی اور تاریخ مذاہب میں ڈاکٹریٹ کر کے آئے۔ دونوں نے جبر کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے وطن کے مجبور اور مقہور عوام کے حقوق اور آزادی کے لئے جدوجہد کی۔

ڈاکٹر شریعتی نے اپنے فکری سفر میں جن شخصیات سے گہرا اثر قبول کیا، ان میں علامہ اقبال سرفہرست ہیں جس کی تصدیق شریعتی کی تحریروں کے مطالعے سے بار بار ہوتی ہے۔

شریعتی کے نزدیک اقبال ایک ایسے مفکر ہیں جو آج کے فکری انتشار، روحانی افلاس

اور جدید تمدن کے انحطاطات اور انحرافات کے بارے میں میرے تمام سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں۔ ان کے ایک طویل بیان کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ اقبال ایک ایسے انسان ہیں جو نہ تو مغرب کی طرح سائنس کو انسانی ارتقاء اور اس کے دکھوں کے مداوا کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے فلسفی کی طرح ہیں کہ جو محض اقتصادی ضروریات کے حصول کو انسان کی تمام ضروریات کا حصول بتاتے ہوں اور نہ ہی اپنے ہم وطنوں یعنی ہندوستان کے بڑے مفکروں اور بدھ مذہب والوں کی طرح ہیں کہ باطن کے صفا اور نروان کو انسان کے مشن کا انجام سمجھتے ہوں اور ساتھ ہی یہ خیال کرتے ہوں کہ معاشرے میں موجود بھوک' غلامی' کمزوری اور استحصال سے قطع نظر کر کے روحانی اور اخلاقی بلندی حاصل کی جا سکتی ہے بلکہ وہ اسلامی فکر کا ایسا تصور پیش کرتے ہیں جو ایک طرف دنیا اور انسان کی مادی ضروریات کی طرف پوری توجہ دیتا ہے اور پھر انسانوں کو ایسا قلب عطا کرتا ہے جو زندگی کے حسن کو آہ سحر گاہی اور فکر و تدبر میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسے انسان ہیں جو ہمارے زمانے میں ٹیکنالوجی کی ترقی اور انسانی شعور کی بلندی کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں (۳۷)۔

ڈاکٹر شریعتی' سید جمال الدین اور اقبال کے حوالے سے جس بات پر زور دیتے ہیں وہ ''اپنی اصل کی طرف مراجعت'' کی تحریک ہے جسے ان دونوں عبقری مفکرین نے پوری امت میں جاری کیا لیکن اس مراجعت کے معنی مقامی اور بدوی خرافات کی طرف ایسی واپسی نہیں ہے جو ''پتھر کے عہد کے انسان'' کی یاد دلاتی ہو بلکہ اپنی اصل کی طرف مراجعت کے معنی ہیں' اپنی شرف و منزلت کی حامل انسانی خصوصیات کی طرف واپسی اور ان فکری اور تمدنی اقدار کا احیاء ہے جو ہم کو آگہی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہوں (۳۸)۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے افکار اقبال کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے اپنے عہد کی پیچیدگیوں پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھا ہے اور عالم اسلام کی تاریخ کے تناظر میں بعض شخصیات کی فکر اور کارناموں کا تجزیہ اپنے اسلوب میں کیا ہے جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران میں نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی اقبال شناسی کی روایت کو شریعتی نے ایک نئی جہت ضرور عطا کی ہے جیسا کہ کبیر احمد جائسی نے خیال ظاہر کیا ہے:۔

''اقبال کی شاعری پر انقلاب سے پہلے متعدد ایرانی ناقدوں اور عالموں نے اظہار خیال کیا تھا مگر اقبال شناسی کا جو دور علی شریعتی کی تقریروں کے بعد سے شروع ہوتا ہے وہ پہلے دور سے مختلف ہے''(۳۹)۔

ایران میں اقبال شناسی کے اس مختصر جائزے کو ہم ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس تجزیے پر ختم کرتے ہیں جو یقیناً چشم کشا بھی ہے اور فکر انگیز بھی:۔

''ایران میں انقلاب کے بعد جتنا کام اقبال پر ہوا ہے اتنا کام پاکستان کو چھوڑ کر کسی اور مسلم ملک میں نہیں ہوا۔ ایران کے علی شریعتی اور حسین نصر نے بھی فکر اقبال سے اپنی فکر و بصیرت کا چراغ روشن کیا ہے۔ جن موضوعات اور سوالات کو اقبال نے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اٹھایا تھا وہ آج مسلم اُمہ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں''(۴۰)۔

دیگر ممالک

بنگلہ ادب کے مطالعہ سے اس پر عربی، فارسی اور اردو کے اثرات کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ بنگلہ میں دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے تراجم اور تنقیدات ملتی ہیں۔ مسلم بنگال میں حالی کی مسدس اور اقبال کی شعری و نثری کاوشوں کے ساتھ بے پناہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ نذرالاسلام کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔

محمد عبداللہ نے اپنے ایک مضمون میں مختصر طور پر ایسی کاوشوں پر روشنی ڈالی ہے جس کے مطابق کوی غلام مصطفیٰ اور ہمایوں کبیر نے مسدس حالی کے منظوم تراجم کئے جبکہ اقبال پر مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے کلام کے بے شمار تراجم ملتے ہیں اور اس ضمن میں پروفیسر امیہ چکرورتی، مولوی تمیز الرحمٰن، قاضی اکرم حسین، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، پروفیسر امین الدین، میزان الرحمٰن، غلام مصطفیٰ، کوی فرخ احمد، پروفیسر آدم الدین اور کئی دوسرے

اصحاب کے نام لئے جاسکتے ہیں (۴۱)۔

بنگلہ ادب پر اقبال کے اثرات کے حوالے سے لکھنے والوں کا اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ جس شخصیت نے سب سے پہلے اقبال سے اہل بنگال کو متعارف کروایا وہ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر امیہ چکرورتی تھے۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور کے سیکرٹری بھی رہے۔ اقبال کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت کی بدولت وہ لاہور میں ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اقبال کی نظم ''ترانہء ملی'' کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا جو ۱۹۱۴ء میں کلکتہ کے ایک ماہنامے ''الاسلام'' میں شائع ہوا۔ بعد میں انہوں نے ''ہمالہ''، ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' اور کئی دوسری نظموں کے تراجم بھی کیے (۴۲)۔

ڈاکٹر چکرورتی کی اقبال سے بے پناہ عقیدت کے باوجود ان کے بعض ہم عصر مسلم ادیبوں نے ان کے کام اور اقبال کو اہل بنگال سے متعارف کرانے کے احسان کو سراہا تو ہے لیکن ساتھ ہی یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ کلام اقبال کے صرف ایسے حصے کے مداح ہیں جس میں وہ مکمل طور پر ایک وطن پرست کے روپ میں جلوہ گر نظر آتے ہیں (۴۳)۔

امیہ چکرورتی کے بعد اشرف علی خان مرحوم کی خدمات کا معترف ہونا پڑتا ہے جو کلکتہ کے ایک بنگالی روزنامہ ''سلطان'' کے ایڈیٹر تھے اور جنہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم ''شکوہ'' کا منظوم بنگالی ترجمہ کیا'' ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کے علاوہ ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' کی بعض منتخب نظموں کا ترجمہ بنگال کے ایک اور مداح' بنگالی ادیب میزان الرحمٰن نے کیا۔

اقبال اور بنگالی ادب کے حوالے سے جو چند ایک مضامین اردو میں لکھے گئے ہیں ان میں بھی جائزہ لیتے ہوئے تاریخی ترتیب کا کوئی خاص اہتمام نظر نہیں آتا لہذا بنگال میں اقبال شناسی کی روایت اور اس کے ارتقاء کے حوالے سے کوئی صحیح تصور قائم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے تناظر میں غیر ملکی زبانوں میں اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر کتب' مقالات' تقاریر اور تراجم کی جو منتخب کتابیات مرتب کی ہیں اس میں بنگلہ دیش کے عنوان کے تحت اہم تصانیف اور تراجم کی تفصیل موجود ہے جس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ ان کی اہم منظومات کے علاوہ ان کے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے "Development of Metaphysics In Persia" اور خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" کو بھی بنگالی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے(۴۴)۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی اقبال پر تصنیف و تالیف اور تراجم کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ضمن میں کئی ادارے بھی قائم ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ڈھاکہ میں قائم ہونے والی ''علامہ اقبال سنگسد'' بھی ایک فعال کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کے زیر انتظام ایک عمدہ انگریزی جرنل "Iqbal Studies" بھی شائع ہوتا ہے۔

انڈونیشیا میں اقبال پر کام کرنے والے سکالرز میں، تراوَرنگ کوتی، للکشما بہرم، ڈاکٹر بہادر اور محمد ناتصر کے نام نمایاں ہیں۔

○

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ''اقبال کا پہلا عرب مترجم: ڈاکٹر عبدالوہاب عزام'' (مضمون) مشمولہ اقبال ممدوح عالم، ص ۳۴۱۔

۲۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبالیاتی جائزے، گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۳۴۔

۳۔ اقبال کا پہلا عرب مترجم، ص ۳۵۶، ۳۵۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۵۷۔

۵۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نقوش اقبال، اردو ترجمہ مولوی شمس تبریز خان، مجلس نشریات اسلام کراچی 1988ء، ص ۳۸۔

۶۔ ڈاکٹر عزام نے یہ الفاظ ۱۹۴۷ء میں مزار اقبال پر منعقدہ یوم اقبال کی ایک تقریب میں شاعر اسلام کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے ادا کئے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کا محولہ بالا مضمون ص ۳۶۱۔ ۳۶۵۔

۷۔ ایضاً ۳۴۲، ۳۴۳۔ ۸۔ اقبالیاتی جائزے، ص ۱۲۶۔ ۹۔ ایضاً ص ۱۳۷۔

۱۰۔ اس مضمون کا ایک اردو ترجمہ پروفیسر خورشید رضوی نے کیا ہے جو اقبال، ممدوح عالم میں شامل ہے (۳۹۱۔ ۴۰۵)، پروفیسر رفیق محمد کا انگریزی ترجمہ ''اقبال۔ مشرق ومغرب کی نظر میں'' میں شائع ہوا۔ دیکھئے (انگریزی حصہ) ص ۱۳۔ ۱۷۔

۱۱۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے محولہ بالا صفحات۔

۱۲۔ ڈاکٹر یحییٰ الخشاب نے ان خیالات کا اظہار قاہرہ میں منعقدہ یوم اقبال کی ایک تقریب میں کیا جس کی تفصیلات اقبال اکادمی پاکستان، کراچی کے مجلہ "Iqbal Review" کے شمارہ اپریل ۱۹۶۷ء میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ص ۹۴ تا ۹۷۔

۱۳۔ تفصیلات کے لئے "Iqbal Review" کا شمارہ اپریل ۱۹۶۷ء اور مقالات یوم اقبال (۱۹۶۷ء) مرتبہ یعقوب توفیق، اقبال کونسل، کراچی ۱۹۶۸ء دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۴۔ اقبالیاتی جائزے، ص ۱۳۸، ۱۴۰۔

۱۵۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان خیالات کا اظہار گورنمنٹ کالج میں مورخہ ۱۵ مارچ ۲۰۰۲ء کو منعقد ہونے والے پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے ۳۵ ویں اجلاس میں کیا تھا۔ راقم نے اسی سال مجلہ راوی ۲۰۰۲ء (گورنمنٹ کالج لاہور) میں شائع ہونے والے اپنے مضمون ''خطبات اقبال کی عصری اہمیت'' میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

۱۶۔ ڈاکٹر انوار احمد ''ترک۔ کلام وفکر اقبال کے آئینے میں'' (مضمون) مشمولہ سہ ماہی ''اقبال'' بزم اقبال لاہور، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۴۵۔

۱۷۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ سید نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور، طبع سوم ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۰۔

۱۸۔ علامہ اقبال بین الاقوامی کانگریس ۱۹۹۸ء میں پڑھا گیا، ڈاکٹر خلیل طوق اُر کا یہ مضمون سہ ماہی ''اقبال'' بزم اقبال لاہور کے شمارہ اپریل ۱۹۹۹ء میں بھی شائع ہوا۔ دیکھئے ص ۵۳، ۶۶۔

۱۹۔ ایضاً ص ۵۶۔

۲۰۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کا مضمون مشمولہ اقبال ممدوح عالم، ص ۳۵۴۔

۲۱۔ ڈاکٹر حنیف فوق، ترکی میں مطالعہ اقبال، مشمولہ اقبال: ممدوح عالم، ص ۴۱۳۔

۲۲۔ ڈاکٹر علی نہاد تارلان، اقبال آفاقی شاعر و نابغہ، مضمون، مشمولہ اقبال: ممدوح عالم، ص ۴۳۶۔

۲۳۔ بحوالہ پروفیسر اریکس ترکمن، ترکی میں مطالعہ اقبال، مشمولہ سہ ماہی ''اقبالیات'' اقبال اکادمی پاکستان لاہور، جنوری۔ مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۶۹۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۲۵۔ علامہ اقبال، تمہید فلسفہ عجم، اردو ترجمہ میر حسن الدین، نفیس اکیڈمی کراچی، پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۔

۲۶۔ پروفیسر سرور گویا اعتمادی، اقبال اور افغانستان (مضمون) مشمولہ مقالات یوم اقبال (۱۹۶۷ء) ص ۳۶۔

۲۷۔ سید محمد محیط طباطبائی، ایران میں اقبال شناسی کا پس منظر (مضمون) اردو ترجمہ ڈاکٹر آفتاب اصغر، مشمولہ

''ایران میں اقبال شناسی کی روایت''، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۲۹۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای ''اقبال۔ مشرق کا بلند ستارہ''، اردو ترجمہ و تدوین، ڈاکٹر سید محمد اکرم، دفتر ثقافتی

نمائندہ، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۹۷۔

۳۰۔ ایران میں اقبال شناسی کی روایت، ص ۷۹۔

۳۱۔ ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، ایران میں اقبال شناسی کی روایت، ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

۳۲۔ ڈاکٹر وحید عشرت، پاکستان میں اقبالیات کا مطالعہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۔

۳۳۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، طبع ہفتم ۱۹۹۸ء، ص ۴۲۶۔

۳۴۔ فرانز فینن کی اس تصنیف کو ''افتادگان خاک'' کے عنوان سے محمد پرویز اور سجاد باقر رضوی نے مشترکہ

طور پر اردو میں ترجمہ کیا جسے نگارشات، لاہور نے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

۳۵۔ ڈاکٹر شریعتی کے سوانحی حالات کے لئے بنیادی طور پر کبیر احمد جائسی کے اس جامع مقدمہ سے استفادہ

کیا گیا ہے جو انہوں نے شریعتی کی کتاب ''اقبال مصلح قرن آخر'' کے اردو ترجمے کے لئے تحریر کیا اور شریعتی کی

اپنی تحریر ''کویر'' کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ بیشتر مقالہ نگاروں نے اسی تحریر پر تکیہ کیا ہے۔ نیز

الطاف جاوید کے مضمون ''اقبال۔ علی شریعتی کی نظر میں''، مشمولہ ''المعارف''، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور،

اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۶ء، جنوری، مارچ ۱۹۹۷ء اور غلام حیدر کے مضمون ''اقبال اور شریعتی''، مشمولہ پیغام آشنا

(علامہ اقبال خصوصی اشاعت) ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۰ء سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۳۶۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی تقریباً تمام کتب اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ بعض کتب کا ترجمہ ایک سے زائد اصحاب نے کیا ہے جیسے ۱۹۷۶ء میں تہران سے شائع ہونے والی کتاب ''ما و اقبال'' کا خواجہ حمید یزدانی کا ترجمہ و تلخیص، سہ ماہی ''اقبال'' (بزم اقبال لاہور) کے اکتوبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ پروفیسر سردار نقوی مرحوم نے بھی اس کو ترجمہ کیا جو بعض جرائد میں قسط وار شائع ہوا (جیسے ماہنامہ طلوع افکار، کراچی) ہمارے پیش نظر جاوید اقبال قزلباش کا ترجمہ ہے جو دفتر ثقافتی قونصلر اسلامیہ جمہوریہ ایران، اسلام آباد کی طرف سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اقبال۔ مصلح قرن آخر کا ترجمہ کبیر احمد جائسی (ریڈر، اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر) نے کیا جو پروفیسر آل احمد سرور کے پیش لفظ کے ساتھ اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر نے شائع کیا جسے فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز لاہور نے بھی ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔

۳۷۔ ڈاکٹر علی شریعتی، ہم اور اقبال، اردو ترجمہ، جاوید اقبال قزلباش، ص ۳۲۔

۳۸۔ ڈاکٹر علی شریعتی (مصلح قرن آخر) ص ۹۵۔

۳۹۔ مقدمہ از کبیر جائسی، علامہ اقبال (مصلح قرن آخر) ص ۲۴۔

۴۰۔ اپریل ۱۹۸۷ء میں پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی میں ''اقبال. فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے خطبات کو اسی عنوان سے دسمبر ۱۹۸۸ء میں کراچی سے شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تعارفی مضمون اسی مجموعے میں شامل ہے۔ دیکھیے ص ۱۱ تا ۱۶۔

۴۱۔ تفصیلات کے لئے دیکھیے محمد عبداللہ کا مضمون ''اقبال بنگلہ میں'' مشمولہ ''اقبال: ممدوح عالم''، ص ۴۷۴ تا ۴۸۰۔

۴۲۔ وفا راشدی، بنگلہ ادب اور اقبال (مضمون) مشمولہ اقبال، ممدوح عالم، ص ۴۸۲۔

۴۳۔ ایسا ہی اعتراض وحید قیصر ندوی کے مضمون ''اقبال اور بنگالی ادب'' مشمولہ ماہ نو لاہور، اپریل ۱۹۵۲ء اور ستمبر ۱۹۷۷ء (اقبال نمبر) میں بھی ملتا ہے۔

۴۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتبہ یہ منتخب کتابیات اُن کی تصنیف ''اقبال اور ہمارے فکری رویے'' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی اشاعت ۲۰۰۲ء کے آخر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

○

بھارت میں اقبال شناسی

بھارت میں اقبال شناسی کی روایت بھی کئی طرح کے نشیب وفراز سے گزری ہے۔ اسے کئی طرح کی مشکلات اور تعصبات کا بھی سامنا رہا ہے۔ بعض مخصوص ترجیحات پر حد سے زیادہ اصرار اور اس کے نتیجے میں مخصوص رجحان سازی کی فضا بھی موجود رہی ہے لیکن اس روایت کے برگ وبار کسی طرح کے حالات میں بھی مرجھائے نہیں بلکہ نشو وارتقاء کے مراحل طے کرتے رہے ہیں۔ البتہ اس روایت کے جائزے اور مطالعے ہمیشہ عصری سیاست سے گراں بار ضرور رہے ہیں۔ برصغیر کے مخصوص سیاسی حالات بھی اس میں کہیں نہ کہیں حائل رہے ہیں لیکن ایک جوئے کہستاں کی طرح یہ روایت اچکتی، اچھلتی، سنبھلتی اور بڑے پیچوں سے بڑی کامیابی کے ساتھ نکلتی ہوئی رواں دواں رہی ہے۔

بھارت میں اقبال شناسی کی روایت کا ایک روشن نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا بھی ہے جن کی وفات (۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء) پر ہمارے ایک کالم نگار نے لکھا:

> ''جگن ناتھ آزاد نے بھارت میں اقبال کے حوالے سے
> اس وقت کام کا آغاز کیا جب بھارت میں اقبال کا نام لینا
> غداری کی ذیل میں آتا تھا''(۱)۔

لیکن ہمارے دانشور کالم نگار نے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ کیا کبھی بھارت میں جگن ناتھ آزاد کو ''غدار'' کہا گیا۔ چلئے وہ تو تلوک چند محروم کا بیٹا تھا' کیا کسی اور اقبال شناس کو کبھی یہ لقب دیا گیا۔ پروفیسر یوسف حسین خان' رشید احمد صدیقی' آل احمد سرور' علی سردار جعفری' اسلوب احمد انصاری' ڈاکٹر عبدالمغنی ایسے کتنے ہی نام لئے جا سکتے ہیں جنہوں نے اقبال پر لکھا' اقبال کا نام لیا' اقبال پر کانفرنسوں' جلسوں کا اہتمام کیا لیکن نہ تو کسی نے ان کو اقبال پہ لکھنے سے روکا نہ اقبال پہ لکھنے پر غدار ہی کہا۔ علمی روایات میں سیاسی نعروں کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔

بھارت میں اقبال شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ایک مضمون سے درج ذیل اقتباس کو حوالہ بنایا ہے:۔

''(۱۹۵۵ء میں) جناب آصف علی اصغر فیضی جموں و کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کے وائس چانسلر تھے۔انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ...... میں تین لیکچر غالب کے فکر وفن پر دوں۔ میں نے ان سے کہا کہ غالب پر بھی کبھی لیکچر دوں گا لیکن اس وقت تو مجھ سے اقبال پر لیکچر دلوایئے۔فیضی صاحب جیسے سناٹے میں آ گئے۔فرمانے لگے: ۱۹۴۷ء سے آج تک کسی نے جموں و کشمیر میں اقبال کا نام نہیں لیا' آپ کیوں اس موضوع پر لیکچر دینا چاہتے ہیں؟ (میں نے کچھ دلائل دے کر کہا) اس یونیورسٹی میں اقبال پر لیکچروں کا انتظام بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا... تین روز غور وفکر کے بعد انہوں نے رسمی دعوت نامہ مجھے دے دیا''[۲]۔

ڈاکٹر ہاشمی نے جگن ناتھ آزاد کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:۔

''اقبالیات کے ضمن میں تقسیم ہند کے بعد ابتدائی سات آٹھ برسوں میں بھارت میں ہمیں سناٹے کی وہی کیفیت نظر آتی ہے جو اقبال پر تین لیکچروں کی تجویز سن کر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر فیضی صاحب پر طاری ہوئی تھی''[۳]۔

''سناٹے'' کے سیاسی محرکات کو انہوں نے اس صورتحال میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم ہندوستان کے بعد بھارت اور کشمیر میں پیدا ہو چکی تھی اور جس میں اقبال کا تصور' دوقومی نظریئے کے ایک پُر جوش داعی اور مبلغ کے طور پر ابھرا تھا جو براہ راست اس تقسیم کا ذمہ دار تھا[۴]۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبالیات کی داستان کو ایک سناٹے اور ہنگامے کی ملی جلی داستان تو ضرور قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کے متعلق کوئی منفی کھلم کھلا پراپیگنڈہ کسی طرح پر ہوا ہو یا کوئی ایسا حکم نامہ جاری ہوا ہو کہ اقبالیات کا موضوع شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہو اور پھر یہ کہ یہ سناٹا علمی اور ادبی ماحول میں نہیں، سماجی اور مجلسی ماحول میں ملتا ہے یا سناٹے سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آزادی کے دو چار سال بعد تک ہمارے ملک کے اہل قلم نے اقبال پر کچھ لکھا ہی نہیں (۵)۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان

بھارت میں اقبال شناسی کو موضوع بنانے والے ان دونوں اقبال شناس حضرات نے اپنے اپنے مضامین میں نہ صرف آزادی کے بعد اقبال کے حوالے سے ہونے والے اہم کام کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں اہم تصانیف پر نظر ڈالی ہے بلکہ ان علمی و ادبی رسائل و جرائد کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں اقبال اور افکار اقبال پر اہم تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی سے پہلے شائع ہونے والی بعض اہم تصانیف، آزادی کے بعد بھی بار بار شائع ہو کر فضا پہ چھائی ہوئی اس خاموشی اور سناٹے کی کیفیت کو توڑنے کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں جس کا بے حد تذکرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ''روح اقبال'' بھی ایسی ہی ایک تصنیف ہے جو پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے (۶)۔

ستمبر ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہونے والے یوسف حسین خان نے اپنی تعلیم اٹاوہ اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے سوربون یونیورسٹی، پیرس سے ''ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندو مسلم تصوف'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن سے ۱۹۵۷ء تک وابستہ رہے اور اسی دوران انہوں نے تاریخ اور عمرانیات کے علاوہ ''روح اقبال'' (۱۹۴۲ء) اور اردو غزل (۱۹۴۹ء) تصنیف کیں۔ ۱۹۵۸ء میں آپ کا تقرر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں بطور پرو وائس چانسلر ہوا جس

پر آپ ۱۹۶۵ء تک فائز رہے۔ ۱۹۶۷ء میں انہوں نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' لکھی۔ کچھ عرصہ انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈیز' شملہ میں ریسرچ فیلو بھی رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ہی ''حافظ اور اقبال'' منظر پر آئی۔ ۱۹۷۷ء میں جشن اقبال صدی کے موقع پر غالب اکیڈمی' دہلی میں ''غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات'' کے موضوع پر دو لیکچر دیئے جو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء میں آپ کا انتقال ہوا اور جامعہ اسلامیہ' دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

''روح اقبال'' کے مباحث کو تین حصوں: ۱۔ آرٹ ۲۔ تمدن ۳۔ مذہب میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں سے آرٹ والا حصہ' انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''اردو'' کے اقبال نمبر (۱۹۳۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ حصہ تمدن کے بعض اجزاء' رسالہ ''سیاست'' میں شائع ہوئے تھے۔ پہلے ایڈیشن (۱۹۴۲ء) کے بعد جتنے ایڈیشن شائع ہوئے' ان میں نئی معلومات کا اضافہ بھی کیا گیا(۷)۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان پر پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنے والی خاتون محقق' ڈاکٹر شبیہ کاظمی نے اپنے ایک مضمون میں ''روح اقبال'' کو اقبال پر لکھی جانے والی دوسری کتب' ''سیرت اقبال'' (از طاہر فاروقی)' ''اقبال کامل'' (از عبدالسلام ندوی)، ''اقبال نئی تشکیل'' (عزیز احمد) اور ''فکر اقبال'' (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) پر فوقیت دی ہے کہ اقبال کے افکار و فلسفوں کو ربط و تسلسل اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے میں ''روح اقبال'' کے علاوہ ان میں سے کوئی بھی تصنیف اس معیار پر پوری نہیں اترتی کیونکہ مذکورہ تصانیف میں اقبال کے افکار و خیالات اس طرح بکھرے پڑے ہیں کہ اقبال کے قاری کے لئے ان کو سمیٹنا' سمجھنا اور ذہن نشین کرنا نہایت مشکل ہے(۸)۔

''روح اقبال'' کی اہمیت مسلمہ ہے اور اقبالیاتی ادب میں مذکورہ دوسری کتب کو بھی گراں قدر مقام حاصل ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر شبیہ کاظمی نے ان کتابوں کے ساتھ ڈاکٹر رفیع الدین کی ''حکمت اقبال'' کا تذکرہ نہیں کیا۔ غالباً وہ ان کی نظر سے نہیں گزری کیونکہ جس طرح سے اس تصنیف میں اقبال کے افکار و خیالات کو ایک مربوط نظام فکر کے تحت پیش کیا گیا ہے اس

کا اعتراف اقبال شناس حلقوں نے بھی کیا ہے۔ البتہ ''روح اقبال'' کے حوالے سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آزادی کے بعد کے ناموافق حالات میں اس کی مسلسل اشاعتوں سے موافقت کی فضا پیدا کرنے میں مدد ملی بلکہ اقبال شناسی کے نئے در بھی وا ہوئے اور اقبال پر قلم اٹھانے والوں کو رہنمائی بھی حاصل ہوئی۔ لہٰذا مختصر الفاظ میں یہ ایک جامع تجزیہ ہے کہ ''روح اقبال'' کو یوسف حسین خان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے''(۹)۔

ڈاکٹر سچد انند سنہا

اس کے برعکس، سال آزادی میں، آزادی سے کچھ پہلے (جنوری ۱۹۴۷ء) میں شائع ہونے والی ڈاکٹر سچد انند سنہا کی انگریزی تصنیف "Iqbal: The Poet and his Message" کو بعض حوالوں سے اقبال کے استرداد کی ایک کوشش سمجھا جاتا ہے(۱۰)۔ اور اکثر اقبال شناسوں نے اسے اقبال کا منفی اور متعصبانہ مطالعہ قرار دیا ہے۔ وہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی ہوں جن کا کہنا ہے ''سنہا صاحب نے اپنا تمام زور قلم اس بات کے ثابت کرنے پر صرف کیا ہے کہ اقبال نہ تو فلسفی تھے نہ شاعر نہ سیاست دان، بلکہ ایک متعصب مسلمان قوم پرست جنہیں صرف اپنی قوم اور اپنے ہم مذہبوں سے ہمدردی تھی۔ وہ اپنے اسلاف کی عظمت کا راگ الاپتے رہے اور دنیا پر مسلمانوں کے تسلط اور اقتدار کا خواب دیکھتے رہے''(۱۱)۔ یا سید عبدالواحد معینی جنہوں نے خود سنہا سے بھی زیادہ سخت زبان استعمال کرتے ہوئے اس کی کتاب کو پوچ اور بیہودہ قرار دیا جو تعصب اور تنگ دلی کی ایک روشن مثال ہے(۱۲)۔

البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سنہا کا شمار بھارت کے ان فضلاء میں کیا ہے جنہوں نے اقبال پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ وہ سنہا کے سماجی مقام اور مرتبے سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ادیب کم اور سیاست دان زیادہ ہیں اور جس زمانے میں انہوں نے یہ کتاب لکھی وہ ہندو مسلم سیاسی کشیدگی کا دور تھا جس کے اثرات اس کتاب میں پیش کئے جانے والے خیالات پر بھی پڑے ہیں(۱۳)۔

کتاب کے آغاز میں مصنف کا تفصیلی تعارف دیا گیا ہے جس کے مطابق سچد انند سنہا،

۱۰ نومبر ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پٹنہ کالج اور پھرسٹی کالج کلکتہ سے تعلیم حاصل کی۔ کلکتہ' الہ آباد اور پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت کی۔ ''ہندوستان ریویو'' کے بانی ایڈیٹر کے طور پر ۱۹۰۰ء سے اپنے فرائض کا آغاز کیا۔ ممبر امپیریل لیجسلیٹو کونسل (۱۹۱۰ء) اور انڈین لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۶ء' گورنر کے ایگزیکٹو کونسلر کی حیثیت میں بہار اور اڑیسہ کی حکومتوں میں وزیر خزانہ اور وزیر قانون رہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور تاحیات سینیٹر پٹنہ یونیورسٹی بھی منتخب ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی (۱۹۳۷ء)۔ انہوں نے اقبال پر لکھی جانے والی زیر بحث تصنیف کے علاوہ تقسیم بنگال' کشمیر' مشاہیر بہار اور کئی دوسرے موضوعات پر انگریزی میں کتابیں تحریر کیں [۱۴]۔

"Iqbal: The Poet And His Massege" پانچ سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے جو اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ابواب کی تعداد ۲۴ لکھی ہے [۱۵]۔ جو درست نہیں۔ نواب یار جنگ بہادر' سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر امرناتھ جھاء نے تعارف اور تنقیدی آراء لکھی ہیں۔ کتاب کے آخر میں تین ضمیمے بھی شامل کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر سنہا نے اٹھائیس ابواب میں اقبال کی حیات' شخصیت اور تصانیف کے علاوہ' ہندوستان کے ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی عظمت' ان کے مذہبی' فلسفیانہ اور سیاسی پس منظر' ان کی اردو' فارسی شاعری' قومی اور بین الاقوامی سطح کے شعراء کے ساتھ ان کے تقابل' ان کے تصور اسلام اور انسان دوستی اور مقبولیت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سنہا نے اس کتاب کو نو برس کی مدت میں مکمل کیا یعنی اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) کے فوراً بعد ہی انہوں نے اس پر کام شروع کر دیا تھا جو ۱۹۴۷ء میں تکمیل کو پہنچا۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے اب تک توصیفی انداز اختیار کیا گیا ہے جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کو صحیح معنوں میں تنقیدی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لہٰذا یہ کتاب ان کے اس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس کے لئے انہوں نے بالخصوص مغربی تنقید نگاروں کے

حوالوں اور اقتباسات سے اپنی کتاب کو پوری طرح سے مزین کیا ہے۔ اور اس کا آغاز باب اول کے صفحہ اول ہی سے ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ''حقیقی تنقید'' سے اقبال کی فلسفیانہ حیثیت' ان کی مذہبیت' تصور ملت' آفاقیت اور فارسیت کو ہدف بنایا ہے اور فیصلہ دیا ہے کہ وہ کسی طرح سے بھی عالمی سطح کے شعراء کی صف میں جگہ نہیں پا سکتے ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو نے اگر ایک طرف ڈاکٹر سنہا کی اس کاوش کو سراہا ہے تو دوسری طرف اس میں اقبال کی فارسی شاعری اور اقبال کے فلسفہ پر لکھے جانے والے ابواب کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے جن میں تنقید کا وہ انداز اختیار کیا گیا ہے جسے اقبال کے مداح کبھی بھی پسندیدہ قرار نہیں دے سکتے (۱۶)۔

ڈاکٹر سنہا کا اقبال پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لئے اردو سے زیادہ فارسی کو اختیار کیا ہے حالانکہ اگر وہ زیادہ سے زیادہ اردو میں لکھتے تو ان کے ہم وطن اس سے بہتر طور پر مستفید ہو سکتے تھے۔ مرزا یار جنگ سمیع اللہ نے ڈاکٹر سنہا کے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے اور ان کے اس اصول کو انہی پر لاگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے اقبال پر کتاب لکھتے ہوئے اپنی مادری زبان کی بجائے انگریزی کا انتخاب کس اصول کے تحت کیا ہے (۱۷)۔

پروفیسر میاں محمد شریف نے "An Unfinished Letter" کے عنوان سے ڈاکٹر سنہا کے اس کتاب میں اپنا موقف دیانتداری اور خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ کا نقطہ نظر میرے موقف کی ضد ہے اور پھر تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر سنہا کے اعتراضات کا جواب دیا ہے (۱۸)۔

بعض ناقدین نے ڈاکٹر سنہا کی کتاب کے علاوہ مجنوں گورکھپوری کی ۱۹۵۰ء کے آس پاس شائع ہونے والی مختصری کتاب ''اقبال (اجمالی تبصرہ)'' کو بھی اقبال پر لکھی جانے والی انہی کتابوں کے زمرے میں شامل کیا ہے جن میں اقبال اور افکار اقبال کا جائزہ لیتے ہوئے ناروا تنقیدی انداز اختیار کیا گیا ہے (۱۹)۔

مجنوں گورکھپوری کی تنقید و تحسین

حالانکہ مجنوں گورکھپوری، اقبال کو پُر جوش انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں صاحب بصیرت اور دانائے راز بھی قرار دیتے ہیں جن کی جگہ مدت تک کوئی دوسرا لیتا نظر نہیں آتا (۲۰)۔

ان کو اقبال کی شاعری میں موجود کئی طرح کی خامیاں بھی کھٹکتی ہیں اور ایک سے زیادہ غلط اور مایوس کن موڑ بھی نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ اقبال کو عہد آفریں شاعر ماننے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو (۲۱)۔

ڈاکٹر سنہا کے برعکس، جو اقبال کی اردو شاعری کے مقابلے میں حالؔی کی مسدس کے زیادہ قائل ہیں، مجنوں گورکھپوری کے نزدیک حالؔی، اقبال کی طرح نہ تو کوئی مفکر تھے اور نہ ہی ان کے اندر ایسی بصیرت تھی جو دور تک مستقبل کا احاطہ کر سکتی..... وہ زیادہ سے زیادہ مسدس کے شاعر ہو سکتے تھے (۲۲)۔

اقبال پر مغربی مفکرین کے اثرات سے متعلق بیشتر اقبال شناسوں کے مباحث افراط و تفریط کی مثال پیش کرتے ہیں لیکن مجنوںؔ کے یہاں اس بحث کے حوالے سے محتاط اور معتدل انداز نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کی فکر و بصیرت کی تربیت میں مغربی حکماء و ادباء کے مطالعے بالخصوص گوئٹے، نطشے، ہیگل، برگساں اور شعراء میں ورڈز ورتھ، ہائنا، براؤننگ اور ایمرسن کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں۔ جرمن فلسفی اور ماہر ریاضیات لائبنز (Leibnitz) کی Theory Of Monads اور فلسفہ خودی میں مماثلت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ اقبال کی اخذ اور جذب کی خداداد صلاحیت کے بھی معترف ہیں جس کی بدولت ان کے ہاں مشرقی خیالات اور مغربی افکار کی ایسی تہذیب اور امتزاج نظر آتا ہے جو اردو شعراء کے ہاں تو کیا ٹیگور کو چھوڑ کر کسی زبان کے شاعر کے کلام میں نہیں ملتا (۲۳)۔

اقبال کے تصور عشق اور آزادی پر خوبصورت بحث کرتے کرتے اچانک مجنوں پر اضمحلال سا طاری ہو جاتا ہے جو ان کے نزدیک سبب ہے اقبال کے آفاقیت اور وسیع تر انسانیت

سے محدود ملت اور حجازیت کی طرف مراجعت کا جو آگے چل کر ایک زیادہ خطرناک میلان کی صورت اختیار کر جاتی ہے جسے مجنوں عقابیت کا نام دیتے ہیں جو فاشزم کی ہی ایک صورت ہے۔ قاری اُس وقت مجنوں سے زیادہ مضمحل اور منتشر ہو جاتا ہے جب مجنوں اقبال کے تخلیقی سفر میں موجود رفعت اور رجعت کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان کی خامیوں کی علت ان کی ''پنجابیت'' کو قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں فکری گمراہیوں اور مایوس کن موڑوں کی نشاندہی کرنے والا مجنوں دفعتاً ایسا ''یوٹرن'' لیتا ہے جو پڑھنے والے کے لئے ناقابلِ فہم بن جاتا ہے۔

اقبال کے بارے میں مجنوں کے ہاں تحسین اور تردید کا یہ متضاد رویہ مسلسل نظر آتا ہے' جس کا احساس یقینی طور پر خود ان کو بھی اور قاری کو بھی ہو جاتا ہے جب بالآخر ان کی بحث کا اختتام بھی اسی مقام پر ہوتا ہے جس سے ان کی بحث کا آغاز ہوا تھا:۔

> ''اقبال اپنی کبھی کبھی کی رجعت' اسلاف پرستی اور بعض اوقات غلط سمتوں مڑ جانے کے باوجود مجھے' زندگی' انقلاب اور ترقی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی اور بالیدگی کی جیسی شدید اور بھرپور قوت اقبال کی آواز میں محسوس ہوتی ہے' نہ ان سے پہلے کسی اردو شاعر کی آواز میں محسوس ہوتی ہے اور نہ ان کے بعد''(۲۴)۔

ڈاکٹر سنہا کی ۱۹۴۷ء میں شائع ہونے والی کتاب "Iqbal: The Poet And His Message" اور مجنوں گورکھپوری کی ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آنے والی کتاب ''اقبال (اجمالی تبصرہ)''، ڈاکٹر ہاشمی کے نزدیک اقبالیاتِ بھارت میں منفی رجحان کی نمائندہ کتابیں ہیں اور چونکہ اقبالیات کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تھی' اس لئے بعد ازاں اس پر تعمیر ہونے والی عمارت کی دیواروں میں ایک طرح کی ''کجی'' بہرحال موجود رہی ہے(۲۵)۔

ان دونوں کتابوں کو اقبالیات کی پہلی اینٹ قرار دینا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ یہ تقسیم کے بعد لکھی جانے والی کتابیں ہیں' تو سوال یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اور خاص طور پر اقبال کی

وفات کے فوراً بعد لکھی جانے والی کتابوں کو اقبالیات کی بنیاد یا اینٹ کیونکر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیا ایسا کرتے ہوئے ہم برصغیر میں اقبال شناسی کی روایت اور اس کے ارتقاء سے چشم پوشی کے مرتکب نہیں ہو جاتے؟ صرف ایک مثال، یوسف حسین خان کی ''روح اقبال'' پر اکتفا کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ اس کو اقبالیات کی بنیاد یا پہلی اینٹ کیوں نہیں کہا جاسکتا۔ صرف ڈاکٹر سنہا اور مجنوں گورکھپوری ہی اس اولیت کے حامل کیوں قرار پاتے ہیں؟ پہلے دو منفی مثالوں (اور یہ بھی بحث طلب مسئلہ ہے) کو بنیاد بنا کر اور پھر پوری روایت کو اس کا عکس قرار دے دینا، کسی روایت کی جانچ اور پرکھ کا درست اور حقیقت پسندانہ انداز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اقبال ایسی ہمہ جہت شخصیت کے افکار اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفہیم میں تحسین کے ساتھ ساتھ تضادات کی نشاندہی بھی کوئی غیر فطری امر نہیں اور نہ ہی اس کو اقبال ناشناسی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اقبال کے افکار زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب کے لئے باعث کشش رہے ہیں اور خود ڈاکٹر ہاشمی کو بھی اس کا اندازہ ہے اور انہوں نے اس کو اقبال کے فکر وفن کا معجزہ قرار دیا ہے کہ مختلف بلکہ متضاد نظریات رکھنے والے (ترقی پسند، جدیدیت پرست، اشتراکی، صوفیہ، آزاد خیال، قدامت پرست اور جماعت اسلامی سے وابستہ) اصحاب نے بسا اوقات یکساں جوش وخروش اور ولولے سے اقبالیات میں دلچسپی لی ہے۔ بہرحال اس طرح وجود میں آنے والا ذخیرہ اقبالیات کا ایسا تابناک باب ہے جس کے بغیر اقبالیات کی کوئی تاریخ ممکن نہیں ہوسکتی (۲۶)۔

بلاشبہ مذکورہ ناموں کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی، میکش اکبر آبادی، ڈاکٹر عشرت حسن انور، ڈاکٹر غلام عمر، میر ولی الدین، عزیز احمد، مولانا ابوالحسن علی ندوی، عالم خوندمیری، آصف جاہ کاروانی، خواجہ غلام السیدین، علی سردار جعفری، اسلوب انصاری، عتیق صدیقی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، آل احمد سرور، مظفر حسین برنی، ڈاکٹر عبدالمغنی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نام اس روایت میں تابناکی کی اہم مثالیں ہیں۔

موخر الذکر شخصیت یعنی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبالیات کے ساتھ والہانہ وابستگی

کے پیش نظر ان کے ایک ہم عصر ڈاکٹر خلیق انجم نے درج ذیل الفاظ میں ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے:-

''ہندوستان میں علامہ اقبال پر سب سے زیادہ اور سب سے بہتر کام پروفیسر آزاد ہی نے کیا ہے''(۲۷)۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی '' اقبالِ کامل ''

مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' ۱۹۴۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اقبالیاتی ادب میں اس تصنیف کو ایک اہم مقام حاصل ہے' اس لحاظ سے بھی کہ بعد میں لکھنے والے اصحاب نے نہ صرف اس کے مباحث کو سراہا بلکہ اس سے استفادہ بھی کیا۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکر اقبال'' کے تعارف میں جن دو تصانیف کی اہمیت کا اعتراف کیا' ان میں ''اقبال کامل'' بھی شامل ہے:-

''میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ' نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں' ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کی ''روحِ اقبال'' اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کی کتاب ''اقبال کامل''۔ ان دو کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور اس کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا دکھائی نہیں دیتا جو محتاجِ تشریح اور تشنۂ تنقید باقی رہ گیا ہو''(۲۸)۔

سید عبدالواحد نے بھی اس کو مایۂ ناز تصنیف قرار دیا جس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ عبدالسلام صاحب نے اس کے سالِ اشاعت تک جو تصنیفات اور تالیفات شائع ہوئی تھیں ان کا بغور مطالعہ کر لیا تھا اور اس میں ان سب کے حوالہ جات بکثرت موجود ہیں (۲۹)۔

''اقبال کامل'' میں اقبال کے سوانحی حالات' تصنیفات اور تصورات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا کا بیان ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب (اقبال) کی زندگی اور

کارناموں کے ہر حصہ کی تکمیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی مناسبت سے میں نے پہلے اس کا نام ''مکمل اقبال'' تجویز کیا تھا اور اب مولانا سید سلمان ندوی نے اس کا نام ''اقبال کامل'' رکھا ہے جو پہلے سے زیادہ بہتر ہے (۳۰)۔

مولانا عبدالسلام نے اپنی اس تصنیف میں نہ صرف اقبال کی اردو' فارسی اور انگریزی تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ ان کی بعض نامکمل اور زیر تجویز کتابوں' جن کے خاکے ان کے دماغ ہی تک محدود تھے اور ان کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی جیسے منطق الطیر' اردو رامائن' فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب' قرآن پاک پر ایک کتاب' اسلامی اصول فقہ کی تجدید' تاریخ تصوف اور اسلام میرے نقطہء نظر سے' پر روشنی ڈالی ہے (۳۱)۔

مولانا ندوی نے جہاں کلام اقبال کے ادبی محاسن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے وہیں کلام میں موجود لفظی اور معنوی غلطیوں کی نشاندہی کیلئے ''اغلاط'' کا عنوان بھی قائم کیا ہے۔

''اقبال کامل'' میں اقبال کے فلسفہء خودی' اس کے ماخذ اور متعلقات پر تفصیلی بحث شامل ہے۔

کتاب کا خاتمہ اقبال کے نعتیہ کلام پر ہوتا ہے جس کے بارے میں مولانا نے انکشاف کیا ہے کہ ''نعتیہ شاعری' ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری کا خلاصہ ہے'' (۳۲)۔

اقبالیاتِ حیدر آباد دکن

اقبال شناسی کی روایت میں حیدر آباد (دکن) کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ حیدر آباد یا عثمانیہ یونیورسٹی سے متعلق اصحاب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں' ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' پروفیسر عزیز احمد' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' پروفیسر غلام دستگیر رشید' ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر غلام عمر کی خدمات اس ضمن میں بے بہا ہیں جن کا علمی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے بھی ان اقبال شناسوں کی خدمات کو سراہا ہے (۳۳)۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اقبالیاتی کاوشوں کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر رضی

الدین صدیقی اور پروفیسر عزیز احمد کا تفصیلی ذکر پاکستان میں اقبال شناسی کے عنوان کے تحت آگے آئے گا گو کہ یہ اصحاب تقسیم سے پہلے اپنے علمی سفر کا آغاز کر چکے تھے۔

حیدر آباد دکن میں قائم اقبال اکیڈمی اپنے مجلے ''اقبال ریویو'' کی باقاعدہ اشاعت، عالمی سطح کے علمائے اقبالیات کے لیکچرز اور دوسری علمی سرگرمیوں کے ذریعے افکار اقبال کے فروغ میں آج بھی متحرک ہے اور اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

عالم خوندمیری

علمائے اقبالیات دکن میں ڈاکٹر عالم خوندمیری بھی ایک قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے تصور زمان کا جس وقتِ نظری سے جائزہ لیا ہے (اور یہ ان کے ڈاکٹریٹ کا موضوع بھی تھا) وہ انہی سے مخصوص ہے۔ ڈاکٹر شمل جوان کے تحقیقی مقالے سے متعلق رہیں، پروفیسر خوندمیری کی بے حد قائل تھیں (۳۴)۔

''اقبال، کشش اور گریز'' ان کا مجموعہ مضامین اقبالیات ہے جس میں سرسید اور اقبال، اقبال اور تصوف، جاوید نامہ کا فکری پس منظر اور اس کے علاوہ اقبال کے تصور زمان پر مضامین شامل ہیں۔

''بیت الامت'' میں افکارِ اقبال کی گونج

حیدر آباد دکن کے حوالے سے جب بھی اقبال کا تذکرہ کیا جائے گا تو نواب بہادر یار جنگ کے دولت خانے ''بیت الامت'' کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا جہاں نواب صاحب کی زندگی اور اس کے بعد بھی سالوں تک ہفتہ کو درس اقبال کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں عام طور پر پروفیسر غلام دستگیر رشید یا ڈاکٹر رضی الدین صدیقی افکار اقبال کے حوالے سے گفتگو کرتے تھے۔ بعض اصحاب نے ان مجالس علمی کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ سید عبدالواحد نے بھی ''نقش اقبال'' میں کئی مقامات پر اس کے بارے میں لکھا ہے اور درس کے حوالے سے خاص طور پر پروفیسر دستگیر کی دقتِ نظر، وسعت مطالعہ اور علامہ سے ان کی والہانہ محبت کو یاد کیا ہے (۳۵)۔

پروفیسر دستگیر نے افکار اقبال کے حوالے سے ''آثار اقبال''، ''حکمت اقبال'' اور ''فکر اقبال'' مرتب کیں جن میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' خلیفہ عبدالحکیم' میر ولی الدین' نواب بہادر یار جنگ' عبدالقادر' عاشق بٹالوی اور بعض دوسروں کے مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر دستگیر کے مجموعوں کے ان عنوانات کو بعد میں خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے بھی اپنایا اور اقبالیاتی ادب کو ''فکر اقبال'' اور ''حکمت اقبال'' کی صورت میں دو غیر معمولی تصانیف حاصل ہوئیں۔

اقبال اکیڈمی حیدر آباد دکن کی طرف سے ۱۹۸۵ء سے جاری کیا جانے والا ''اقبال ایوارڈ'' حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر عالم خوندمیری اور مظفر حسین برنی کے علاوہ پروفیسر غلام دستگیر رشید بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین

ڈاکٹر ہاشمی نے دکن کے اقبال شناسوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر میر ولی الدین کو یاد نہیں رکھا جن کی تصنیف ''رموز اقبال'' حیدر آباد دکن ہی سے پہلی بار ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی جس میں ان کے مندرجہ ذیل پانچ مضامین شامل ہیں جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے:۔

۱۔ فلسفہء خودی ۲۔ نظریہ عقل و عشق ۳۔ حدیث جبر و قدر

۴۔ عہد حاضر کا انسان ۵۔ مسلمان کی زندگی۔

یہ سب مضامین اپنی جگہ اہم ہیں جن میں فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے لیکن اول الذکر (فلسفہ خودی) جو اس مجموعے کا طویل ترین مضمون ہے' کئی لحاظ سے اہم بھی ہے۔

میر ولی الدین نے خودی کی ماہیت کی وضاحت کے لئے نہ صرف قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کی ہے بلکہ فلاسفہء مشرق و مغرب اور صوفیانہ فکر سے بھی استدلال کیا ہے۔

انہوں نے فلسفیانہ تشکیک کی اساس پر زمین و آسمان اور کاخ و کوُ کے بارے میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا اس جہان رنگ و بو میں کوئی شے حقیقی کہلائی جاسکتی ہے؟ وہ ڈیکارٹ کی راہ پر چلتے ہیں لیکن یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ خارجی اشیاء کی حقیقت سے انکار نہیں کر رہے ہیں محض شک کا اظہار کر رہے ہیں کہ انسان کا علم محدود اور مقید ہے۔ کائنات کی ہر شے کے بارے میں شک کیا جاسکتا ہے لیکن یہ شک کرنا یعنی سوچنا شک سے بالاتر ہے اور ''میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں'' کو اس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے کہ میری ذات یا خودی کے متعلق کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ میری روح' یا میری انا' یا میری خودی کا وجود میرے لئے ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔ یہی یافت بقول پروفیسر وائٹ ہیڈ کے افلاطون کے زمانے کے بعد سب سے زیادہ عظیم الشان فلسفیانہ یافت ہے۔ یہی فلسفہ ء جدید کا نقطہ ء نظر ہے اور اقبال کا فلسفہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے اور اسی مرکزی نقطہ کے گرد گردش کرتا ہے اور اسی کی روشنی میں کائنات' خودی اور خدا کی توجیہ کرتا ہے (۳۶)۔

میر ولی الدین ہوں یا اُن کے دیگر اقبال شناس رفقا' وہ سب افکار اقبال میں خودی کی مرکزی اہمیت کو تو تسلیم کرتے ہیں اور اپنے طویل یا مختصر مضامین میں اس کا جائزہ بھی لیتے ہیں لیکن میکش اکبر آبادی کی طرح کم لوگوں نے فلسفہ ء خودی کو ایک مستقل کتاب کا موضوع بنایا ہو گا جو ''نقد اقبال'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

میکش اکبر آبادی

میکش نے خودی کی تفہیم کے لئے نفی ءخودی کا راستہ اختیار کیا ہے اور وحدت الوجود کو بنیاد بناتے ہوئے اقبال کی مخالفت کی وجہ نفی ءخودی ہی کو قرار دیا ہے اور پھر حضرت ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود' سری شنکر کے نظریہ مایا' بدھ مت کے نروان اور افلاطون کے اعیان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کا نتیجہ ان کے الفاظ میں یہ نکلتا ہے کہ:۔

> ''ابتداء میں اقبال نے وحدت الوجود کی مخالفت کرتے
> ہوئے ابن عربی اور سری شنکر کے نظریات کے فرق کو واضح

طور پر نہ سمجھا اور نہ ہی تصوف کے تصور فنا اور بدھ مت کے فنا
کے فرق کو محسوس کیا حالانکہ ان میں لفظی مشابہت کے سوا
کوئی شے مشترک نہیں۔ مزید یہ کہ اقبال نے تصوف کو ترک
عمل کے مترادف خیال کیا جو کہ کسی طور بھی درست نہیں اور
تصوف کی آخری منزل فنا نہیں بقا ہے اور خود اقبال کا
فلسفہء خودی اور تصور انسان کامل بھی اسلامی تصوف سے
ماخوذ ہیں''(۳۷)۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور

بھارت کی مختلف یونیورسٹیوں میں اقبال پر ہونے والے پی ایچ۔ ڈی کی سطح کے تحقیقی کام پر نظر ڈالی جائے تو اس میں نظریاتِ اقبال کے حوالے سے ان کی مابعد الطبیعیات' تعلیمات' تصوف' مغربی اثرات' شعریات' تقابل افکار وغیرہ کو موضوع بنایا گیا لیکن ایسے مقالات بھی لکھے گئے ہیں جو براہ راست تصور خودی یا متعلقات خودی پر مبنی ہیں۔

اقبال پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا پہلا تحقیقی مقالہ ۱۹۴۳ء میں عشرت حسن انور۔ نے سید ظفر الحسن کی نگرانی میں " Metaphysics of Iqbal " کے موضوع پر لکھا جس پر انہیں شعبہء فلسفہ' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہوئی (۳۸)۔

تحقیقی مقالے کے مختلف ابواب میں وجدان' خودی' عالم مادی اور وجود مطلق یا خدا پر بحث ملتی ہے۔ سید ظفر الحسن کی رائے کے مطابق:۔

''ضرورت تھی کہ اقبال کے بنیادی تصورات' وجدان' خودی'
عالم مادی اور خدا کی پوری احتیاط سے چھان بین کر کے
انہیں قطعیت کے ساتھ متعین کر دیا جائے۔ ڈاکٹر عشرت
نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور اسے کامیابی سے پورا
کیا''۔(۳۹)۔

ڈاکٹر عشرت نے مابعد الطبیعیات اقبال کو موضوع بناتے ہوئے اولاً صرف ان کی فلسفیانہ تحریروں جو کہ بیشتر خطبات اور ایرانی مابعد الطبیعیات (تحقیقی مقالہ۔ فلسفہء عجم) پر مشتمل ہیں کو بنیاد بنایا ہے۔ ثانیاً انہوں نے اقبال کی شاعری، قرآن اور مسلم صوفیاء اور فلاسفہ کے حوالوں سے احتراز کرتے ہوئے کہ یہ ایک علیحدہ موضوع کی حیثیت سے تحقیق کا متقاضی ہے، خود کو مغربی فلاسفہ، میک ٹیگرٹ، برگساں، نطشے، برکلے، لائبنز اور کانٹ کے اثرات اور اقبال کی اصلاحات وترمیمات کے مباحث تک محدود رکھا ہے[۴۰]۔

ڈاکٹر عشرت کے نزدیک اقبال کا فلسفہ بھی اصل میں خودی کا فلسفہ ہے۔ اور یہ خودی ہی ان کے فکر کا نقطہء آغاز بھی اور بنیاد بھی اور مابعد الطبیعیات تک رسائی کا ذریعہ بھی اور جس کی حقیقت کا انکشاف ان کو براہ راست وجدان کے ذریعے سے حاصل ہوا اور خودی کا وجدان ہمیں اپنے ذاتی تجربے کی حقیقت کا ایقان مہیا کرتا ہے۔ وجدان کے ذریعے ہی سے خودی کی حقیقت اور ماہیت کا انکشاف ہوتا ہے اور ہمیں اس کی ہادیانہ (Directive)، آزاد یعنی خود مختار (Free) اور غیر فانی صفات کا علم ہوتا ہے[۴۱]۔

خودی کی ماہیت اور اس کی مختلف صفات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے انہوں نے کانٹ، ہیگل، ڈیکارٹ، میک ٹیگرٹ، برگساں، ہالڈین کو حوالہ بنایا ہے اور ایغو یا خودی کو براہ راست عمل سے متعلق کیا ہے جو بقائے دوام کے استحقاق کا ذریعہ بنتی ہے۔

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی کے تحقیقی مقالے کا موضوع ہی ''اقبال کا فلسفہء خودی'' تھا جس پر الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی[۴۲]۔

مقالہ، اقبال کی حیات، تصانیف اور ذہنی ارتقاء کے علاوہ، فلسفہء خودی، استحکام خودی، ماخذ خودی پر مشتمل ہے جبکہ آخری باب میں مختلف اسلامی مکاتیب (جبریہ معتزلہ، اشاعرہ، تصوف) ہندو اور بدھ دھرم اور مغربی مادیتی فکر کی روشنی میں مقصدِ خودی کی وضاحت کی گئی ہے جو خودی سے متعلق اب تک کے مباحث میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

خود ڈاکٹر آصف بھی اس احساس کا اظہار کرتے ہیں:۔

''میں نے اس موضوع کے تحت علامہ اقبال کے فلسفہء خودی کی تعریف' نوعیت' خودی کی حیات و ارتقاء' شخصیت' لافانیت وغیرہم مسائل سے بحث کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی خودی کس طرح انتہائی خودی سے صادر ہوتی ہے اور اس کا خودیء لایزال سے کیا تعلق ہے نیز یہ کہ اس کی بقا اور استحکام کا دارمدار کن باتوں پر ہے۔ نظریہء خودی کی تشریح اس شکل میں پہلی بار اردو میں پیش کی جارہی ہے''(۴۳)۔

ڈاکٹر آصف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اقبال کے فلسفہء خودی کے ماخذ پر کوئی باقاعدہ تصنیف میری نظر سے نہیں گزری' مختلف مصنفوں کے جستہ جستہ بیانات ضرور ہیں......اور اقبال کے فلسفہء خودی کے صحیح مقصد کی طرف تاحال توجہ نہیں دی گئی(۴۴)۔

لہٰذا فلسفہء خودی کے ان تشنہ یا نامکمل پہلوؤں پر زیر بحث مقالے میں توجہ دی گئی ہے اور ان کمیوں کو پورا کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔

''میں نے اس مقالے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے فلسفہء خودی کا مقصد انسان کو اپنی آزادانہ خودی اور شخصیت سے آگاہ کر کے کارزار حیات میں بحیثیت خالق لانا ہے' بوسیدہ روایات وعقائد کے بتوں اور پست ہمتی اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر فکر وعمل کو نئے ماحول اور ضروریات کے مطابق ترتیب دینا ہے''(۴۵)۔

جشن اقبال صدی۔ بھارت میں

پاک وہند میں اقبال شناسی کی روایت میں ایک تموج کی صورت جشن اقبال صدی

کے موقع پر دیکھنے میں آئی۔ چونکہ اقبال کے سالِ ولادت پر اختلاف کی وجہ سے پہلے ۱۹۷۳ء ہی کو اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے طور پر منانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں لیکن طویل بحث و تمحیص و تجسس کے بعد بالآخر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی اقبال کی صحیح تاریخ ولادت قرار پائی اور ۱۹۷۷ء ہی کو جشن اقبال صدی کے طور پر منانے کا فیصلہ ہوا۔ سرِ دست صرف بھارت تک محدود رہتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ سالِ اقبال کے حوالے سے شروع ہونے والی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا سلسلہ درازتر ہوتا چلا گیا جن کا ذکر و محور اقبال اور فکر اقبال ہی قرار پایا اور نیتجتاً یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آزادی کے بعد اگر بھارت میں اقبال کے حوالے سے کوئی خاموشی تھی تو وہ جشن صدی کی بدولت اقبال کے نغموں اور ترانوں میں بدل گئی۔

اس حوالے سے منعقد ہونے والی تقریبات، سیمینارز، نمائشوں اور مشاعروں کی تفصیلات بہت کچھ بیان ہو چکی ہیں۔ اقبال کی حیات اور فکر و فن پر مبنی تصنیفات و تالیفات اور تحقیقی مقالات کا تفصیلی جائزہ بجائے خود ایک تحقیقی موضوع ہے۔ دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد، کشمیر اور کئی دوسرے شہروں میں اقبالیاتی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ علمی و ادبی جرائد جیسے ''آجکل''، ''آواز''، ''اردو ادب''، ''ھما''، ''جامعہ'' (دہلی)، ''شاعر''، ''قومی آواز'' (بمبئی)، ''شیرازہ''، ''اولیاء''، ''تعمیر'' (سری نگر)، ''نگار'' (لکھنو)، ''شعور''، ''اقبال ریویو'' (حیدرآباد) کے علاوہ کئی روزانہ اخباروں نے اقبال پر خصوصی نمبر شائع کیے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن مراکز سے خصوصی پروگرام نشر ہوئے۔

شیخ عبداللہ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' قائم ہوئی۔ یہ دنیا کی کسی بھی درسگاہ میں قائم ہونے والی پہلی اقبال چیئر تھی جس نے بعد میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی صورت اختیار کر لی۔

افکارِ اقبال کے فروغ کے ضمن میں علی سردار جعفری، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، آل احمد سرور، عبدالقوی دسنوی، گوپی چند نارنگ، پروفیسر وحید الدین، ممنون حسن خان، ڈاکٹر عبدالغنی، کلیم الدین احمد، عتیق صدیقی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر عبدالحق، سید حامد جلالی، مظفر حسین برنی، حامدی کاشمیری، ظ۔ انصاری، پروفیسر شکیل الرحمن، عبداللطیف

اعظمی اور خاص طور پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی خدمات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

علی سردار جعفری کی اقبال شناسی

معروف ترقی پسند دانشور اور ادیب علی سردار جعفری کی ''اقبال شناسی'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی (۴۶)۔ علی سردار جعفری ہندوستان میں اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے لئے قائم ہونے والی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر اقبال پر ایک دستاویزی فلم بھی بنائی جس کی فلمبندی کے لئے وہ پاکستان بھی تشریف لائے۔

کتاب کے پاکستانی ناشر نے ''اقبال شناسی'' اسی امید اور دعوے کے ساتھ شائع کی کہ یہ کتاب شاعرِ مشرق کی شاعری اور فلسفہ کو سمجھنے میں ممد و معاون ہو گی کیونکہ مصنف نے اقبال کے فلسفہ اور شاعری کا جائزہ ایک نئے زاویئے سے لیا ہے اور افکارِ اقبال کو ان کے تاریخی تناظر میں سائنسی نقطہء نظر سے پرکھا ہے (۴۷)۔

ادب کے قارئین کے لئے یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ یہ ''نیا زاویہ'' ترقی پسندانہ ہے جو بالآخر عظمتِ اقبال کی دریافت کا ذریعہ بنا ہے۔

کتاب کا انتساب جناب اندر کمال گجرال کے نام ہے اور ابتداء میں ''سردار اور اقبال'' کے عنوان کے تحت آل احمد سرور کا درج ذیل قطعہ دیا گیا ہے:۔

ہماری فکر بھی اقبال کے شعلے سے روشن ہے
اسی کے فیض سے روشن ہمارے خون کی لالی
سُرور اس واسطے سردار سے مجھ کو محبت ہے
کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی
(۴۸)

سردار جعفری نے آغاز میں اپنی ایک نظم بعنوان ''اقبال'' بھی شامل کی ہے جس میں اقبال کے اسلوب میں اقبال کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے:۔

ناتوانوں کو عطا کی قوت ضرب کلیم
تو نے بخشے ملتِ بے پر کو بال جبرئیل
آزران عصرِ حاضر کے صنم خانوں میں آج
گونجتا ہے تیرے دم سے نغمہء ساز خلیل

(۴۹)

اقبال کی شاعری نے مختلف سطحوں پر بیداری کا جو عمل پیدا کیا' سردار جعفری اس کو تین دائروں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے اقبال کو مسلم بیداری کا شاعر قرار دیتے ہیں جس میں ایشیائی بیداری بھی شامل ہے۔ دوسرا دائرہ ہندوستان کی بیداری ہے جس میں پوری تحریک آزادی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ان دائروں سے گزر کر اقبال عالم انسانیت کی بیداری کے تیسرے دائرے کو چھوتے ہیں جس میں سردار جعفری نے اشتراکی افکار و انقلاب کی فتح کو بھی شامل کیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اقبال کی دوسری اور تیسری حیثیت ان کی پہلی حیثیت کی تردید نہیں بلکہ توثیق اور توسیع ہے جو صحیح معنوں میں اقبال کو ایک عالمی شاعر کے مرتبے پر فائز کرتی ہے (۵۰)۔

اسی دیباچے میں کچھ آگے چل کر وہ اقبال کے فکری تضادات کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں جو ان کے عہد کی دین ہیں لیکن ان تضادات کے نتیجے میں اقبال کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی (۵۱)۔ شاید اسی لئے انہوں نے ان تضادات کی نشاندہی اپنی اس کتاب میں ضروری خیال نہیں کی البتہ اسی کتاب میں شامل تین مقالات: ۱۔ شاعر مشرق ۲۔ اقبال اور فرنگی ۳۔ اقبال کا تصور وقت' کے بارے میں اتنی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے کہ ان میں اقبال کے فکر و شعر کے ان ترقی پسند پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے بغیر اقبال کی عظمت کا راز سمجھ میں نہیں آ سکتا (۵۲)۔

سردار جعفری نے ''اقبال شناسی'' میں شامل پہلے مضمون ''شاعر مشرق (تحریک آزادی کے پس منظر میں)'' کی ابتداء میں لکھا:۔

''۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات کو جب

ہندوستان کی آزاد مجلس قانون ساز (Constituent
Assembly) میں آزاد ہندوستان کا ترنگا جھنڈا پیش کیا گیا
تو شریمتی سوچترا کرپلانی نے اقبال کا ترانہء ہندی
گایا''(۵۳)۔

گویا اقبال کے حوالے سے ہندوستان میں سرکاری پالیسی کی بنیاد یہی ''ترانہء ہندی'' ہی قرار پایا اور بعد میں اسی کی تکرار اور اسی کا چرچا زیادہ کیا گیا جیسا کہ رفیع الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ اقبال کے ساتھ اہلِ ہند کی محبت کا سب سے بڑا حوالہ ''ترانہء ہندی'' ہی ہے جو اقبال کی یاد میں جاری کیے گئے یادگاری ڈاک ٹکٹ پر اقبال کی شبیہ کے ساتھ بھی درج ہوتا ہے اور اہل قلم کے مباحث میں بھی زیادہ زور اقبال کی شاعری کے ''ہندوستانی عناصر'' پر ہی دیا جاتا ہے''(۵۴)۔

اقبال کے حوالے سے مرتب کی جانے والی ایسی سرکاری پالیسیوں سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے محض بھارت تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ہم اور آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ وطن عزیز میں مزدور کسان کا نعرہ بلند کرنے والی جماعت برسر اقتدار آ جائے تو ذرائع ابلاغ شب و روز ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' کے انقلابی ترانوں سے گونجتے رہتے ہیں اور اگر کوئی ڈکٹیٹر جمہوری عمل معطل کر کے اقتدار پر قابض ہو جائے تو اقبال کو جمہوریت مخالف ثابت کرنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ گویا بندوں کو گننے کا نظام ختم اور تولنے کا کام شروع ہو جاتا ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ ترازو ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور چٹے بٹے سب اس کی اپنی تھیلی ہی کے ہوتے ہیں۔ گویا سرکار بدلتے ہی سرکاری پالیسی بھی بدلتی رہی ہے اور اقبال کے مفید اور من پسند پہلوؤں کا ہی چرچا کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل یہ بھی سرکاری سرپرستی کا ایک شاخسانہ ہے کہ قومی شاعر اور مفکر مختلف حکومتوں کے ہاتھوں میں ''یرغمالی'' بن کے رہ جاتا ہے اور حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ' اس کی نئی شان اور نئی آن سامنے آتی رہتی ہے۔ سرکاری دانشوروں کے لئے قومی شاعر کو اسلام دوست' انسان دوست' جمہوریت مخالف وغیرہ ثابت کرنا قطعاً مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی مصلحتوں اور پالیسیوں کے شکار ہو کر قومی شاعر کے

اشعار اور افکار شکار کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ تو افکار کی وحدت برقرار رہتی ہے اور نہ ہی ان افکار کی اساس پر قائم ہونے والی مملکت میں کبھی حقیقی رنگ ہی بھرے جاسکتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

جشن ولادت کی مناسبت سے شائع ہونے والی اہم کتابوں میں سے ایک پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' بھی ہے جس میں اقبال کی طویل اور مختصر اہم نظموں کی تشریح وتفسیر پیش کی گئی ہے۔ان نظموں میں جہاں ''شمع وشاعر''،''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام''، ''مسجد قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' اور ''ساقی نامہ'' اور ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' شامل ہیں وہیں ''تسخیر فطرت''،''تنہائی''، ''لا الٰہ الا اللہ''،''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' اور ''شعاع امید'' کو بھی منتخب کیا گیا۔

کتاب میں شامل تیرہ نظموں کے بارے میں نظموں کے شارح پروفیسر انصاری کا کہنا ہے کہ:۔

> ''ان منتخب نظموں کو تحلیل' تجزیے اور چھان بین (Evaluation) کے اس عمل سے گزارا گیا ہے' یعنی ان نظموں کی بیرونی ہیئت اور جسمانیت پر نظریں جما کر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے اندر خیالات اور مرکزی اقدار حیات کس طرح کے تفاعل سے منسوب کئے جاسکتے ہیں''(۵۵)۔

لیکن تحلیل، تجزیے اور چھان بین کے اس عمل کے لئے جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ منفرد ہے اور اس کی سطح بلند ہے۔اہم شعری وتنقیدی مصطلحات کے انگریزی مترادفات بھی عبارت میں جابجا دیئے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر تشریح وتجزیہ عام سطح کے اعتبار سے مشکل پسندی سے گرانبار ہے اور شرح مزید کی طلب بدستور رہتی ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا ایک اور مجموعہ مضامین ''نقش اقبال'' بھی شائع ہو

چکا ہے۔ علی گڑھ سے ان کی ادارت میں نکلنے والا مجلّہ ''نقد و نظر'' بھی ان کی علمی اور اقبالیاتی خدمات کا آئینہ دار ہے۔

پٹنہ کے دو اقبال شناس۔ کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی

پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی ادبیات سے تعلق رکھنے والے دو اصحاب نظر ایسے ہیں جن کا بھارت میں اقبال شناسی کی روایت کے حوالے سے ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر عبدالمغنی کے اسمائے گرامی محتاج تعارف نہیں۔ اردو تنقید میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی ''نظر'' کا بہت تذکرہ اور چرچا رہا ہے کہ ''جب بھی ڈالی بُری نظر ڈالی'' کے مصداق ان کی جارحانہ اور جانبدارانہ تنقید اپنی سنسنی خیزی کی بدولت متوجہ ہی نہیں مشتعل بھی کرتی ہے جبکہ ان کے برعکس ان کے ہم وطن اور ہم عصر ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید میں ٹھہراؤ' وزن اور استحکام جیسی خصوصیات موجود ہیں۔

کلیم الدین احمد کی ''اقبال۔ ایک مطالعہ'' (۱۹۷۹ء) میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا بیشتر علمی و تحقیقی کام اقبال سے متعلق ہے۔ انہوں نے ''اقبال اور عالمی ادب'' (۱۹۸۲ء)' ''اقبال کا نظام فن'' (۱۹۸۴ء)' ''تنویر اقبال'' (۱۹۹۰ء)' ''اقبال' دی پوئٹ'' (Iqbal- The Poet) (۱۹۹۰ء) اور ''اقبال کا نظریہ خودی'' جیسی کتابیں لکھ کر برصغیر میں ایک اقبال شناس کے طور پر بھی خود کو منوایا ہے۔

کلیم الدین احمد کے تنقیدی ہتھیار ان کے خود ساختہ مغربی معیارات ہیں جن پر اردو شعر و ادب کی کوئی بھی شخصیت حتیٰ کہ اقبال بھی پورے نہیں اترتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عبدالمغنی خم ٹھونک کر میدان میں اترتے ہیں اور اقبال کے دفاع میں اپنا پورا تنقیدی زور صرف کر دیتے ہیں۔

عتیق صدیقی

ڈاکٹر ہاشمی نے مطالعہ اقبال کے حوالے سے جہاں ان دونوں معاصر ناقدین کی کتابوں کو مختلف اور متضاد زاویوں سے تعبیر کیا ہے [۵٦]۔ وہیں عتیق صدیقی کی تصنیف

''اقبال' جادوگر ہندی نژاد'' کو بھی بھارت میں لکھی جانے والی پیچیدہ کتابوں میں شمار کیا ہے جو مطالعہ اقبال کے بعض اہم زاویوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے(۵۷)۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

بھارت میں اقبال کے حوالے سے ہونے والے کام کا جائزہ لیتے ہوئے ہم پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ فقرہ جو ایک طرح سے ان کے ایک علمی فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے' نقل کر چکے ہیں کہ ''ہندوستان میں علامہ اقبال پر سب سے زیادہ اور سب سے بہتر کام پروفیسر (جگن ناتھ) آزاد ہی نے کیا ہے''۔ یقیناً یہ رائے مستحسن ہوگی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ سب سے زیادہ کیا جانے والا کام کیونکر سب سے بہتر بھی ہے' اور بھارت میں مطالعہ اقبال کے حوالے سے جو مختلف زاویہ، ہائے نگاہ اب تک زیر بحث آئے ہیں' پروفیسر آزاد کا کام کہاں تک ان سے مطابقت رکھتا ہے اور کہاں ان سے مختلف اور منفرد ثابت ہوتا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو عیسیٰ خیل' ضلع میانوالی (پاکستان) میں جنم لینے والے جگن ناتھ آزاد کا شمار برصغیر کے ممتاز شعراء اور نامور اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ ان کے والد تلوک چند مرحوم بھی اردو کے نامور شاعر اور استاد تھے جنہوں نے آزاد کی علمی اور ادبی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم میانوالی ہی میں حاصل کی۔ بی۔ اے ۱۹۳۷ء میں گورڈن کالج راولپنڈی سے کیا۔ ۱۹۴۴ء میں ایم اے فارسی اور ۱۹۴۵ء میں ایم۔ او ایل کی ڈگریاں پنجاب یونیورسٹی' لاہور سے حاصل کیں۔ وہ صحافت اور وزارت اطلاعات سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ شعبہ اردو' جموں یونیورسٹی (جموں وکشمیر) سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۳ء تک ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ' جموں یونیورسٹی کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔ ۱۹۸۸ء سے اپنی وفات (۲۰۰۴ء) تک وہ تاحیات ایمریٹس فیلوشپ جموں وکشمیر یونیورسٹی کے منصب پر فائز تھے۔

جگن ناتھ آزاد اس کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں کہ اپنے والد کے علاوہ ان کو شعر وسخن میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی رہنمائی بھی حاصل ہوئی اور کالج اور پھر یونیورسٹی میں ڈاکٹر آر۔ آر سٹوارٹ' جے۔ بی کنگز' پروفیسر جسونت رائے' خان بہادر شیخ نور الٰہی' پروفیسر مدن گوپال سنگھ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (علامہ اقبال نہیں)، مولانا علم الدین سالک، صوفی تبسم، سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع نصیب ہوا۔ ان کے علاوہ حسرتؔ، جوشؔ، یگانہؔ، فراقؔ، جگرؔ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق، سر عبدالقادر، پطرس بخاری، مولانا صلاح الدین اور حفیظؔ جیسی برگزیدہ ہستیوں سے بھی سیکھنے کا موقع ملا (۵۸)۔

ان کی اردو، انگریزی تصنیفات و تالیفات کی تعداد پچاس سے زائد ہے جس میں ان کے شعری مجموعے، طویل نظمیں، تنقیدی مضامین، خودنوشت، منتخبات، سفرنامے اور مرتبہ کتابیں شامل ہیں۔ صرف اقبال پر لکھی جانے والی اہم کتابوں کی تعداد بارہ کے قریب ہے جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اقبال اور اس کا عہد (۱۹۶۰ء)

۲۔ اقبال اور مغربی مفکرین (۱۹۷۵ء)

۳۔ اقبال کی کہانی (۱۹۷۶ء)

۴۔ اقبال اور کشمیر (۱۹۷۷ء)

۵۔ اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری (۱۹۷۷ء)

۶۔ مرقع اقبال (۱۹۷۷ء)

۷۔ بچوں کا اقبال (تالیف) (۱۹۷۷ء)

۸۔ فکر اقبال کے بعض اہم پہلو (۱۹۸۲ء)

۹۔ محمد اقبال: ایک ادبی سوانح حیات (۱۹۸۵ء)

۱۰۔ ہندوستان میں اقبالیات اور دوسرے توسیعی لیکچر (۱۹۸۹ء)

۱۱۔ (اقبال کی مفصل سوانح عمری ''روداد اقبال'' کا نامکمل منصوبہ)

۱۲۔ Iqbal: His Poetry and Philosophy (1982)

۱۳۔ Iqbal: Mind and Art (1983)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں

میں اقبالیات اور اس سے متعلقہ موضوعات پر دیئے گئے توسیعی خطبات اور پڑھے جانے والے مقالات کی تعداد ایک سو پچاس سے متجاوز ہے۔ آپ کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو بیسیوں انعامات واعزازات سے نوازا گیا جن میں ۱۹۷۷ء میں پنجاب یونیورسٹی اقبال صدی میڈل' ۱۹۸۰ء میں اقبال میموریل ٹرسٹ' مالیر کوٹلہ' پنجاب کی طرف سے اقبال ایوارڈ مع خلعت وطشتِ سمیں اور ۱۹۸۹ء میں کشمیر یونیورسٹی' سری نگر کی طرف سے ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری بھی شامل ہے[۵۹]۔

خلیق انجم پروفیسر آزاد کے اعزازات کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''اس سے بڑا اعزاز ایک شاعر اور خاص طور سے غیر مسلم شاعر کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو پاکستان کے قیام کے اعلان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان' لاہور سے جو ترانہ نشر ہوا' وہ آزاد صاحب کا لکھا ہوا تھا''[۶۰]۔

پروفیسر آزاد ۱۹۷۷ء میں لاہور اور سیالکوٹ میں منعقد ہونے والی پہلی اقبال عالمی کانگریس کی مجلس انتظامیہ کے اس فیصلے کو بھی اپنے لئے ایک بہت بڑا اعزاز قرار دیتے ہیں جس کی رُو سے کانگریس کے مندوبین پر مشتمل لاہور سے علامہ اقبال کے جدی مکان' سیالکوٹ جانے والے جلوس کی قیادت کے لئے ان (جگن ناتھ آزاد) کو منتخب کیا گیا[۶۱]۔

یہ واقعہ بھی حقیقتاً پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبال کے ساتھ گہری وابستگی اور اقبال عالمی کانگریس کے مندوبین میں ان کی منفرد حیثیتِ علمی کی دلیل ہے۔

۱۹۷۳ء میں اقبال کی عظمت کا ترانہ بلند کرنے کے لئے سری نگر میں اقبال نمائش کا اہتمام اور اس کے بعد بھارت کے تمام بڑے شہروں میں اس سلسلے کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے اور اقبال کے حوالے سے پائی جانے والی سرد مہری اور تنگ نظری کو مٹانے کے لئے جانفشانی سے چلائی جانے والی یہ مہم بھی پروفیسر آزاد کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

اقبال شناسی کی روایت میں، کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' کا قیام اس لحاظ سے بھی ایک اہم اقدام ہے کہ یہ دنیا کی کسی بھی علمی درسگاہ میں قائم ہونے والی پہلی ''اقبال چیئر'' تھی (بعد میں اقبال انسٹی ٹیوٹ) اور اس تاریخ ساز منصوبے کے محرک بھی پروفیسر جگن ناتھ آزاد تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پروفیسر آزاد کی کوششوں سے قائم ہونے والی پہلی ''اقبال چیئر'' ہی دوسری اقبال چیئر قائم کرنے کا ذریعہ بھی بنی تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ۱۹۷۷ء میں اقبال عالمی کانگریس منعقدہ لاہور میں ارباب اختیار کی موجودگی میں پنجاب یونیورسٹی میں اقبال چیئر سے متعلق سوال پروفیسر آزاد نے ہی کیا تھا اور جس کے بعد اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اقبال چیئر کے قیام کا اعلان کرنا پڑا۔

پروفیسر آزاد اس واقعے کا تذکرہ بڑے دلچسپ اور پُر جوش انداز میں اپنی تحریروں میں کرتے ہیں اور آخر میں یہ ضرور بتاتے ہیں:۔

> ''راقم التحریر کے بعض دوستوں نے ہنسی مذاق میں اس فیصلے کی مبارکباد راقم التحریر کو دی''(۶۲)۔

پروفیسر آزاد کی اقبال کے ساتھ وابستگی کا عالم یہ ہے کہ اقبال پر بارہ کے قریب مستقل تصانیف کے علاوہ بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی نہ کسی طور اقبال کا ذکر موجود ہے جس کی توجیہہ ڈاکٹر اسد اللہ وانی کے الفاظ میں اس طرح سے ہی کی جاسکتی ہے کہ:۔

> ''ذکر اقبال آزاؔد کے لئے ذکر محبوب کی حیثیت رکھتا ہے''(۶۳)۔

آزاؔد کی پہلی نثری تصنیف ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' (رپورتاژ) ۱۹۵۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی (۶۴)۔ اس میں بھی اقبال کا ذکر موجود ہے۔ ''پشکن کے دیس میں'' سفرنامہ، روس ہے جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال' آزاؔد کے ساتھ ساتھ ہیں۔

اقبالیات کے موضوع پر آزاؔد کی پہلی تصنیف ''اقبال اور اس کا عہد'' ۱۹۶۰ء میں شائع

ہوئی جو دراصل جموں کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر لکھے جانے والے درج ذیل تین لیکچروں کا مجموعہ ہے:۔

۱۔شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر

۲۔اقبال کے کلام کا صوفیانہ لہجہ

۳۔اقبال اور اس کا عہد

آزاد کی اقبال کے ساتھ عقیدت اور وابستگی اپنی جگہ لیکن ان کی اقبال شناسی محض عقیدت پر نہیں بلکہ چند اہم فکری اصولوں پر استوار ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر و فکر اقبال سے متعلق آزاد کے تصورات' بعض پرستارانِ اقبال کے مبہم اور موقع پرستانہ نظریات کے برعکس بہت واضح' شفاف اور مکمل تھے۔''اقبال اور اس کا عہد'' کی ابتدائی سطور میں خود انہوں نے اس کی وضاحت بھی کی ہے:۔

''تقسیم ہند کے بعد جہاں پاکستان نے اقبال کو اپنا ملی ہیرو قرار دیا وہاں ہندوستان نے اقبال سے ایک طرح کی بے اعتنائی برتی۔ یہ بے اعتنائی انہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی جو پرستارانِ اقبال نے اقبال کے بارے میں پیدا کی ہیں اور ابھی تک جن کا سلسلہ جاری ہے''(۶۵)۔

اقبال کے معتقدین یا مخالفین کی جانب سے اقبال کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں یا اقبال کے ساتھ روا رکھی جانے والی مخاصمت کے کئی فکری اور سیاسی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کو دو وجوہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔اولاً اقبال کی اسلامی اصولوں کے ساتھ بے پایاں وابستگی اور ثانیاً ان اسلامی اصولوں کی اساس پر ایک الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ۔

جگن ناتھ آزاد نے اس حوالے سے ہمیشہ واضح اور اصولی مؤقف کا اظہار کیا اور مخالفین کو اس کا جواب مدلل طور پر فراہم کیا ہے۔

اسلام کی محبت نہ تو اقبال کی عظمت کو کم کرتی ہے اور نہ ہی آزاد کے الفاظ میں اسے

اقبال اور کلام اقبال کے ساتھ بے اعتنائی برتنے کا جواز بنایا جا سکتا ہے کہ تاریخ ادب میں اقبال کوئی پہلی مثال نہیں ہیں۔ آزاد نے ملٹن اور دانتے کی مثال دی ہے جو عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے جبکہ تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اور آزاد کے نزدیک تو عشقِ مذہب' عشق بنی نوع انسان تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے (٦٦)۔

پروفیسر آزاد تصور پاکستان کے حوالے سے اقبال کے کردار کو نہ صرف واضح طور پر تسلیم کرتے تھے بلکہ کسی سیاسی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر اپنا مؤقف پیش کرتے تھے۔ ایک انٹرویو کے دوران ان کو کسی نام نہاد تحقیق کے حوالے سے تصور پاکستان اور مسلم سٹیٹ کے دو الگ نظریات میں الجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے دوٹوک انداز میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

> ''یہ صحیح ہے کہ علامہ کی نظم یا نثر میں پاکستان کا لفظ موجود نہیں لیکن آپ جسے ایک الگ مسلم سٹیٹ کہہ رہے ہیں وہ پاکستان ہی تو ہے'' (٦٧)۔

اس سے یہ سمجھ لینا بھی قطعی طور پر درست نہیں کہ انہوں نے اقبال کو جو کچھ لکھا وہ اقبال کی عقیدت سے سرشار ہو کر لکھا یا پھر محض اقبال کی حمایت میں تحریر کیا بلکہ ان کا مطالعہء اقبال' گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور فکرِ اقبال سے متعلق کئی اہم سوال بھی اٹھاتا ہے اور اقبالیات کے طالب علموں اور سکالروں کو دعوتِ فکر بھی دیتا ہے جیسے ایڈورڈ تھامپسن' جواہر لال نہرو اور کانٹ ویل سمتھ نے جو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اقبال اپنی عمر کے آخری حصے میں مطالعہء پاکستان کے حامی نہیں رہ گئے تھے تو اس ضمن میں پروفیسر آزاد اپنے واضح مؤقف کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کی کسی تحریر (نظم یا نثر) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مطالعہء پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے' البتہ وہ اس مسئلے پر کھل کر بحث کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ ہماری نئی نسل اقبال کے بارے میں کم از کم اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ اقبال نے اپنے دور کی اہم ہستیوں سے کہا کچھ اور' اور اپنی کتابوں میں لکھا کچھ اور (٦٨)۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے بھارت میں جب اقبال پر لکھنے کا آغاز کیا تو اس حوالے حالات ناموزوں اور ناسازگار تھے لیکن یہ ان کی اقبال دوستی اور ثابت قدمی تھی جو حالات کو سازگار بناتی چلی گئی۔

ہمارے عہد کے اس نامور انسان دوست اور اقبال دوست پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مورخہ ۲۴ جولائی ۲۰۰۴ء کو رات نو بجے دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے آخری دنوں میں بھی اقبال سے متعلق کئی علمی منصوبوں کی تکمیل میں منہمک تھے۔

O

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عطاء الحق قاسمی،روزن دیوار سے (الوداع جگن ناتھ آزاد)،روزنامہ ''جنگ''،لاہور،۱۲ اگست ۲۰۰۴ء۔

۲۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے جگن ناتھ آزاد کے اس اقتباس سے اپنے مضمون ''بھارت میں اقبالیات'' کا آغاز کیا ہے جو ان کی کتاب ''اقبالیاتی جائزے'' شائع کردہ گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۹۰ء (۱۴۵) میں شامل ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے مضمون ''ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد'' کا ماخذ مجلّہ ''اوراق'' لاہور، جون، جولائی ۱۹۸۹ء درج کیا ہے۔ یہی مضمون مکمل صورت میں ''اردو زبان۔ مسائل اور امکانات'' مرتبہ سید شوکت علی شاہ، مجلس تقریبات ملی، پاکستان لاہور ۱۹۹۲ء (۱۰۶،۷۱) میں بھی شامل ہے۔

۳۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبالیاتی جائزے، ص ۱۴۵۔

۴۔ ایضاً ص ۱۴۵،۱۴۶۔

۵۔ جگن ناتھ آزاد، ہندوستان میں اقبالیات (آزادی کے بعد) ص ۷۴،۸۲۔

۶۔ ''روح اقبال'' پہلے ایڈیشن ۱۹۴۳ء کے بعد ۱۹۴۴ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں بھی شائع ہوئی اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ پاکستان میں پہلی بار یہ تصنیف ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔

۷۔ تفصیلات کیلئے دیکھئے دیباچہ ''روح اقبال'' پاکستانی ایڈیشن' آئینہ ادب' لاہور ۱۹۶۳ء۔

۸۔ ڈاکٹر شبیہ کاظمی' تنقیدی تجزیے (پبلشر کا نام نہیں دیا گیا) ۱۹۹۳ء' ص ۳۶۔

۹۔ مسعود حسین خاں' تعارفی کتابچہ (ہندوستانی ادب کے معمار)' یوسف حسین خان' ساہتیہ اکادمی' نئی دہلی ۱۹۹۰ء' ص

۱۰۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا کی ضخیم انگریزی تصنیف "Iqbal: The Poet and His: Message" رام نرائن لال پبلشر اینڈ بک سیلر' الہ آباد کی طرف سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ قاضی احمد میاں اختر (جوناگڑھی)' اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ' ۱۵۷۔

۱۲۔ سید عبدالواحد معینی' نقش اقبال' آئینہ ادب' لاہور ۱۹۶۹ء' ص ۱۷۷۔

۱۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ' اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح' صحیفہ (اقبال نمبر) ۱۵'۱۶۔

۱۴۔ پروفیسر میاں محمد شریف کے سنہا کے نام لکھے گئے خط کا اردو ترجمہ ''اقبال کا شعری پیام'' (ڈاکٹر سنہا کی کتاب پر تنقید) کے عنوان سے ''مقالات شریف'' شائع کردہ بزم اقبال لاہور ۱۹۹۴ء (ص ۹۳_۱۰۳) میں شامل ہے۔

۱۵۔ ڈاکٹر سید عبداللہ' اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح' ص ۱۵۔

۱۶۔ دیکھئے ڈاکٹر سنہا کی کتاب میں شامل سر تیج بہادر سپرو کی رائے ص xxxi' ص xxxiv۔

۱۷۔ مرزا یار جنگ کے تعارفی کلمات کو بھی ڈاکٹر سنہا کی کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے کتاب مذکورہ کا ص xi۔

۱۸۔ پروفیسر میاں شریف کے ڈاکٹر سنہا کے نام لکھے گئے خط کا اردو ترجمہ ''اقبال کا شعری پیام (ڈاکٹر سنہا کی کتاب پر تنقید)'' کے عنوان سے ''مقالات شریف'' شائع کردہ بزم اقبال' لاہور' ۱۹۹۴ء (۹۳_۱۰۳) میں شامل ہے۔

۱۹۔ مجنوں گورکھپوری کی کتاب (یا کتابچہ) ''اقبال (اجمالی تبصرہ)'' ایوان اشاعت گورکھپوری کی طرف سے شائع ہوئی' اس کے ساتھ ہی آسی پریس' گورکھپور کے الفاظ بھی درج ہیں۔ اگلے صفحہ پر تاریخ اشاعت کہیں درج نہیں البتہ تعارفی صفحات میں ایک جگہ ۱۹۵۰ء لکھا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سال اشاعت بھی ۱۹۵۰ء ہو سکتا ہے۔

۲۰۔ مجنوں گورکھپوری' اقبال (اجمالی تبصرہ) ص ا۔

۲۱۔ ایضاً ص ۴۔

۲۲۔ ایضاً ص ۵۔

۲۳۔ تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے اقبال (اجمالی تبصرہ) ص ۱۸ تا ۲۰۔

۲۴۔ ایضاً ص ۱۰۶۔

۲۵۔ اقبالیاتی جائزے' ص ۱۶۷۔

۲۶۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' بھارت میں اقبال شناسی (مضمون) مشمولہ ماہنامہ ''کتاب نما'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی' اپریل ۱۹۹۰ء' ص ۱۵۔

۲۷۔ ڈاکٹر خلیق انجم' ہندوستان میں اردو تحقیق و تدوین کا کام (۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۵ء تک) (مقالہ) مشمولہ بھارت میں اردو' اکادمی ادبیات پاکستان' اسلام آباد' ۱۹۸۷ء' ص ۱۲۷۔

۲۸۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' فکر اقبال' بزم اقبال' لاہور' بار سوم ۱۹۶۴ء' ص ۸۔

۲۹۔ سید عبدالواحد' نقش اقبال' آئینہ ادب' لاہور' ۱۹۶۹ء' ص ۱۶۲۔

۳۰۔ عبدالسلام ندوی' مولانا' اقبال کامل' مکتبہ ادب لاہور' ۱۹۶۷ء' ص ۳'۴۔

۳۱۔ تفصیل کیلئے دیکھئے' اقبال کامل' ص ۹۴ تا ۹۷۔

۳۲۔ ایضاً' ص ۳۴۷۔

۳۳۔ اقبالیاتی جائزے' ص ۱۶۰۔

۳۴۔ پروفیسر سراج الدین نے این میری شمل کی یاد میں لکھے گئے ایک مضمون میں انہیں عالم خوندمیری کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا نگران بھی بتایا ہے۔ دیکھئے ماہنامہ ''اقبال ریویو'' اقبال اکیڈمی حیدر آباد (دکن)' نومبر ۲۰۰۳ء' ص ۶۹۔

۳۵۔ نقش اقبال' ص ۱۶۹۔

۳۶۔ تفصیل کیلئے دیکھئے ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ''رموز اقبال'' کتاب منزل' لاہور' طبع دوم ۱۹۵۰ء میں شامل مضمون فلسفہ خودی (ص ۱۱ تا ۶۴)۔

۳۷۔ میکش اکبر آبادی' نقد اقبال' آئینہ ادب' لاہور' طبع سوم ۱۹۷۰ء' ص ۳۰۶' ۳۰۷' ۳۰۸۔

۳۸۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور کا تقریباً اسی (۸۰) صفحات پر مشتمل تحقیقی مقالہ "Metaphysics of Iqbal" پہلی بار شیخ محمد اشرف' لاہور کی طرف سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ ''اقبال کی مابعد الطبیعیات'' کے عنوان سے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے کیا جو پہلی بار ۱۹۷۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۸۸ء میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

۳۹۔ پیش لفظ' اقبال کی مابعد الطبیعیات' ص ۷۔

۴۰۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اپنے طریق تحقیق کی تفصیلی وضاحت دیباچے میں کی ہے' دیکھئے ص ۹ تا ۱۱۔

۴۱۔ اقبال کی مابعد الطبیعیات' ص ۶۱۔

۴۲۔ ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی کا مقالہ ''اقبال کا فلسفہء خودی'' اردو اکیڈمی' سندھ ۱۹۷۷ء میں شائع کر چکی ہے۔

۴۳۔ اقبال کا فلسفہء خودی' ص ۱۰۔

۴۴۔ ایضاً ص ۱۱' ۱۲۔

۴۵۔ ایضاً ص ۱۲' ۱۳۔

۴۶۔ علی سردار جعفری کی ''اقبال شناسی'' پاکستان میں پیپلز پبلشنگ ہاؤس' لاہور کی طرف سے پہلی بار دسمبر

۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

۴۷۔ایضاً عرض ناشر۔

۴۸۔ایضاً ص ۶۔

۴۹۔ایضاً ص ۹۔

۵۰۔دیباچۂ اقبال شناسی ص ۱۱۔

۵۱۔ایضاً ص ۱۲۔

۵۲۔ایضاً ص ۱۲۔

۵۳۔ایضاً ص ۲۱۔

۵۴۔اقبالیاتی جائزے ص ۱۶۱۔

۵۵۔پروفیسر اسلوب احمد انصاری پیش لفظ ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۔

۵۶۔اقبالیاتی جائزے ص ۲۰۵۔

۵۷۔ایضاً ص ۱۸۱۔

۵۸۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے بارے میں یہ تفصیلات محمد اسد اللہ وانی کے ساتھ ایک بات چیت میں بیان کیں۔ یہ انٹرویو خلیق انجم کی مرتبہ ''جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات)'' محروم میموریل لٹریری سوسائٹی نئی دہلی (۱۹۹۳ء) اور ''اقبالیات آزاد'' مرتبہ ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی (۱۹۹۷ء) میں شامل ہے۔

۵۹۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تصنیفات اور اعزازات کی تفصیل کیلئے ''اقبالیات آزاد'' مرتبہ ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ یہ تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ''انعامات واعزازات'' کے عنوان سے صفحہ نمبر ۸۸ پر نمبر شمار ۸۰ کے تحت پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۱ء کی جانب سے یاسمین کوثر کو ''جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دیئے جانے کی اطلاع ہے جو درست نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۸۹ نمبر ۹۴ کے تحت اسی یونیورسٹی سے ۱۹۹۲ء میں عاصمہ عزیز کو ''جگن ناتھ

آزاد بطور نثر نگار'' پر لکھے جانے والے مقالے پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کی اطلاع بھی درست نہیں ہے۔ یہ دونوں مقالات ایم۔ اے کی ڈگری کے حصول کیلئے لکھے گئے۔

۶۰۔ خلیق انجم، جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات) ص ۱۰۔ اس ترانے کا پہلا بند درج ذیل ہے:۔

اے سرزمین پاک!
ذرے ذرے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک
تندیٔ حاسداں پہ ہے غالب تیرا سواک
دامن وہ سل گیا ہے جو تھا مدتوں سے چاک
اے سرزمین پاک!

۶۱۔ ''اقبالیات آزاد'' میں شامل انٹرویو (جگن ناتھ آزاد سے بات چیت'' ص ۱۷۱۔

۶۲۔ ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد، ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

۶۳۔ اقبالیات آزاد، ص ۱۳۵۔

۶۴۔ ''اقبالیات آزاد'' میں ''تصنیفات و تالیفات'' کے تحت اس رپورتاژ کا سن اشاعت ۱۹۵۱ء درج ہے، دیکھئے (ص ۴۱) جبکہ صفحہ ۱۳۵ پر اس کا سن اشاعت ۱۹۵۰ء درج ہے۔

۶۵۔ جگن ناتھ آزاد، اقبال اور اس کا عہد، (حرف آغاز) الادب، لاہور، پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۔

۶۶۔ ایضاً ص ۱۰، ۱۱۔

۶۷۔ اقبالیات آزاد (جگن ناتھ آزاد سے بات چیت) ص ۱۸۱۔

۶۸۔ جگن ناتھ آزاد، اقبال اور مغربی مفکرین، مکتبہ عالیہ، لاہور، پاکستان میں پہلی بار ۱۹۷۷ء، ص ۸۵۔

O

باب ششم

پاکستان میں اقبال شناسی

بیسویں صدی کے دوران میں علمی، فکری، سائنسی اور سیاسی شعبوں میں ایسی کئی شخصیات نمایاں ہوکر سامنے آئیں جنہوں نے اپنے نظریات، خیالات، ایجادات اور خدمات کی بدولت ناموری حاصل کی، اقبال بھی انہی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ان کو اپنے معاصرین میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے خیالات کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ برصغیر کی سیاست میں ان کے پیش کردہ تصور کی اساس پر ایک نظریاتی مملکت وجود میں آئی۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی حیات، خیالات اور خدمات پر دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں تحقیقات و توضیحات اور تراجم و تشریحات کی صورت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے ایک جائزے کے مطابق:۔

> ''دنیا کی کم از کم ۲۶ زبانوں میں اقبال کی نظم ونثر کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے سوانح، افکار اور شاعری پر ۲۲ زبانوں میں ایک عظیم الشان ذخیرہ کتب و جرائد وجود میں آ چکا ہے جس کی تعداد ۲ ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہوگی''[۱]۔
>
> تحقیق و تجسس کا یہ سلسلہ جاری ہے جس پر اردو دنیا فخر کر سکتی ہے۔

پاکستان میں اقبال شناسی کی روایت پر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالی جائے تو اس کی مختلف اطراف و جہات کا اندازہ ہو جاتا ہے جس کو ہم آسانی کے ساتھ حیاتِ اقبال، فکریات وشعریات اقبال، تراجم و تشریحات اقبال اور تحقیقات اقبال میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک صدی پر پھیلی ہوئی اس علمی روایت کے مختلف محرکات اور رجحانات کا کسی قدر اندازہ عالمی سطح پر اقبال شناسی کے مختصر جائزے سے یقیناً ہو جاتا ہے جس کی مفصل تاریخ اور تفصیلی تجزیہ ایک مکمل تحقیقی مقالے کا متقاضی ہے اور محض ایک باب میں اس کو سمونا اور سمیٹنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہمارا مقصود ہے۔البتہ

دنیائے مغرب، عالم اسلام اور بھارت میں اقبال شناسی کے مختصر جائزے کے بعد اب حتمی طور پر اس روایت کے اہم اور اساسی مرکز تک پہنچتے ہیں جہاں سے اس روایت کے برگ و بار پھوٹے ہیں جس سے حریت، اخوت، مساوات اور امن عالم کا پیغام حاصل ہوتا ہے۔

اقبال کے مشق سخن کے سالوں سے قطع نظر کرتے ہوئے بیسویں صدی کے آغاز کو اقبال کے تخلیقی سفر کا بھی آغاز سمجھا جانا چاہئے لیکن ان ابتدائی سالوں میں ہی بعض جوہر شناس نگاہوں نے اقبال کے تخلیقی Genius کو بھانپ لیا تھا۔ اس ضمن میں محمد دین فوق، شیخ عبدالقادر اور چکبست کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جنہوں نے اپنے مضامین میں اقبال کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا تھا(۲)۔

نواب ذوالفقار علی خان کا اعزاز

اقبال کی زندگی ہی میں ان کے قریبی دوست نواب ذوالفقار علی خاں نے ان پر انگریزی میں ایک مختصر کتاب: "A Voice from the East" (The Poetry of Iqbal) کے عنوان سے تحریر کی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی(۳)۔ باوجودیکہ اس سے پہلے پروفیسر نکلسن ''اسرار خودی'' کو انگریزی میں ترجمہ کر چکے تھے، لیکن نواب ذوالفقار علی خاں ایک دوست کی حیثیت سے اقبال کی صحبتوں سے فیضیاب ہو چکے تھے اور ان کے ذاتی حالات اور خیالات سے بخوبی آگاہ بھی تھے برصغیر کے سیاسی حالات اور اردو شعر و ادب کے ارتقاء پر بھی گہری نظر رکھتے تھے جس کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے اور پھر اقبال پر قلم اٹھانے کے لئے جو علمی ذوق درکار ہے، اس سے بھی بہرہ ور تھے۔

کتاب کا دیباچہ اقبال کے دوست اور مداح امراؤ سنگھ نے تحریر کیا جو انگریزی صحافت سے وابستہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ کتاب میں اقبال کے اردو اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی ان کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ البتہ ''اسرار خودی'' کے اشعار کے لئے پروفیسر نکلسن کے انگریزی ترجمہ پر انحصار کیا گیا۔

تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں

برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ انحطاط، نشاۃ الثانیہ، اقبال کی ابتدائی زندگی، قیام یورپ کے زمانے کے علاوہ اقبال کی بعض اردو نظموں، جن میں ''تصویرِ درد''، ''محبت''، ''صقلیہ'' وغیرہ شامل ہیں اور ''اسرارِ خودی'' کے بعض منتخب حصوں پر تجزیہ و تبصرہ شامل ہے۔

نواب ذوالفقار علی خاں نے اپنے پیش لفظ میں اس کی تصنیف کا مقصد اقبال کی شخصیت اور شاعری سے اہلِ مغرب کو متعارف کروانا قرار دیا تھا اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر یہ فقرہ بھی رقم کیا تھا:۔

> "If the Peacock throne is the pride of Persia, and the lustrous Koh-i-Noor, the glory of the British Crown, Iqbal would surely adorn the court of the muses in any country"(۴)

اور ساتھ ہی اقبال کی فکر کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے اسے نہ صرف نوآبادیاتی ممالک کے محکوم عوام کی عظمت اور وقار کی بحالی کے لئے ایک نسخۂ کیمیا سے تعبیر کیا اور ساتھ ہی اسے سامراجی جارحیت کے لئے ایک وارننگ (Warning) بھی قرار دیا(۵)۔

مصنف کے نزدیک اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد ایک ایسے مثالی انسان کے تصور کی تشکیل ہے جس کی شخصیت کو تربیت اور ریاضت کے سخت مراحل سے گزار کر ایک ایسی تبدیلی سے دوچار کرنا ہے جو دنیا کے حالات کی تبدیلی کا ذریعہ بن سکے۔ اقبال کا انسان کامل، نطشے کے مذہب و اخلاق سے عاری فوق البشر کے برعکس، الٰہی صفات سے بہرہ ور ہے اور پوری انسانیت کے لئے سراپا نعمت کی حیثیت رکھتا ہے(۶)۔

مولوی احمد دین

نواب ذوالفقار علی خاں کی طرح، مولوی احمد دین(۷) کا شمار بھی اقبال کے ان دوستوں میں ہوتا تھا جن کے ساتھ گہری اور پُرخلوص دوستی تاعمر قائم رہی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی

رہی ہو کہ دونوں کشمیری النسل ہونے کے ساتھ ساتھ تقریباً ہم عمر بھی تھے اور دونوں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے تعلیم حاصل کی تھی۔ احمد دین بھی پیشہء وکالت سے وابستہ تھے اور شروع ہی سے علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اردو، فارسی اور عربی ادب کے علاوہ انگریزی ادب کی بے شمار کتابیں بھی ان کی ذاتی لائبریری میں موجود تھیں۔ ادبی مجلسوں اور تحریکوں میں بھی باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔ خاص طور پر انجمن حمایت اسلام کے امور سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی۔ انجمن کشمیری مسلماناں میں بھی دونوں دوست شامل رہے تھے۔ اقبال، احمد دین کی قانونی مہارت کے بھی قائل تھے اور اپنے مقدمات کے سلسلے میں ان سے مشورہ بھی کرتے رہتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں کے حلقہء احباب میں شامل اکثر دوست دونوں کے مشترکہ دوست بھی تھے جن میں سر فضل حسین، خلیفہ نظام الدین، مولوی محبوب عالم، رائے بہادر پنڈت درگا داس، سر عبدالقادر، سر محمد شفیع اور چوہدری شہاب الدین نمایاں ہیں (۸)۔

احمد دین اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں اور علمی و سماجی دلچسپیوں کے علاوہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف کار رہے۔ مشفق خواجہ نے ان کے سوانح حیات میں ان کی بیس تصنیفات و تالیفات کا جائزہ پیش کیا ہے جن میں اقبال پر لکھی جانے والی کتاب ''اقبال'' (علامہ سر اقبال کی اردو منظومات، ان کے مقصدِ شاعری اور خیالات کے نشوونما، مضامین کلام اور طرز بیان پر ایک نظر) کی اشاعت کا قصہ دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے پہلے اقبال کے بارے میں چند مضامین اور نواب ذوالفقار علی خان کی مختصر کتاب "A Voice from the East" (جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے) شائع ہو چکی تھی۔ لیکن احمد دین نے پہلی بار اقبال کی شاعری کے فکری پس منظر اور ذہنی ارتقاء پر تفصیل سے قلم اٹھایا تھا اور اس وقت تک اقبال کی شائع ہونے والی نظموں میں سے بھی بیشتر تبصرے اور تجزیے کے ساتھ اس میں شامل تھیں بلکہ اقبال اپنے جس کلام کو از خود خارج کر چکے تھے وہ بھی کتاب میں شامل تھا۔ شاید انہی وجوہ کی بناء پر اقبال نے اس کتاب کی اشاعت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مولوی احمد دین نے غصے میں آ کر کتاب کے تمام نسخوں کو نذر آتش کر دیا۔ جو دو نسخے کسی طرح جلنے سے بچ گئے تھے، مقدمہ نگار کی اطلاع کے مطابق وہ آج بھی احمد دین کے وارثوں کے پاس موجود ہیں۔ ''بانگِ درا'' کی اشاعت کے بعد مولوی احمد دین نے ''اقبال'' کو

دوبارہ ترتیب دے کر ۱۹۲۶ء میں باراول کے طور پر شائع کر دیا [۹]۔

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے: (کلام اقبال' مضامین کلام' طرز بیان) جس میں اقبال کے ذہنی ارتقاء اور شاعری کے مقرر کردہ تین ادوار پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی اقبال کے اردو کلام سے اس کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

مولوی احمد دین نے اقبال کی شاعری کے تناظر میں ان کے فلسفہء خودی کا بھی مختصر جائزہ لیا ہے اور خودی کو خودداری کے مماثل قرار دیتے ہوئے اسے دلِ مسلم کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے:۔

''وہ علوِ ہمت سے کام لے' خود اپنے دل کے اندر ایک نئی دنیا بنالے' نئے جذبات ہوں' نئے نئے ولولے' نئی کشمکش ہو' نئے ہنگامے ہوں' اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو اور اغیار کی محتاجی سے قطعاً آزاد۔ کسی کے پاس حاجت لے جانے سے' چاہے جان بچانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو' مرنا بہتر سمجھے۔ اگر خودداری اس کا عمل ہوگا' اگر خود کا احساس اسے میسر ہوگا تو مصیبت میں درجات برکت اور افتادگی میں سامانِ سرفرازی ملیں گے'' [۱۰]

مصنف نے کتاب کے آخر میں اقبال کی شاعری کے مقاصد اور اس کے حاصل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنی شیوا بیانیوں سے قومی ادبیات میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ہم تو کلام اقبال کی صورت ظاہری کے بھی دلدادہ ہیں مگر معنوی محاسن کے لحاظ سے اقبال کا پایہ اردو شاعری میں بلا ریب بہت بلند ہے'' [۱۱]

نواب ذوالفقار علی خاں کی مختصر انگریزی کتاب کے بعد' اقبال پر انگریزی زبان میں

کئی اور کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں عبداللہ انور بیگ کی :۔

"The Poet of the East"، شیخ اکبر علی کی "Iqbal: His Poetry and Message" اور بی۔ اے ڈار کی "Iqbal's Philosophy of Society" بالترتیب ۱۹۳۰، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں لاہور سے شائع ہوئیں جن کی اپنی اہمیت ہے۔

اقبال کی زندگی میں ہی ان کے فکروفن پر خصوصی اشاعتوں کا آغاز ہو گیا تھا، اس ضمن میں ''نیرنگ خیال'' کے ''اقبال نمبر'' (۱۹۳۲ء) کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اقبال کی وفات کے فوراً بعد گویا ان کی حیات، فکروفن اور خدمات کے حوالے سے مختلف جرائد کی طرف سے اقبال نمبروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جن میں سے بعض اپنی وقعت اور اہمیت کی بدولت کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے جیسے ''جامعہ''، ''اردو'' اور ''شیرازہ'' کے اقبال نمبر ''جوہر اقبال''، ''اقبال'' اور ''اقبال نامہ'' کی صورت میں شائع ہوئے (۱۲)۔

سید محمد حسنین کی مرتبہ ''جوہر اقبال'' میں ڈاکٹر عابد حسین جامعی، ڈاکٹر عبدالحمید اور پروفیسر محمد مجیب کے مضامین شامل ہیں جبکہ ''اقبال'' (مرتبہ مولوی عبدالحق) میں مضامین کا زیادہ بہتر انتخاب شامل ہے جن میں ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون ''اقبال کا تصورِ خودی''، خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون ''رومی، نطشے اور اقبال'' اور ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مضمون ''اقبال اور آرٹ'' کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحمید، سید بشیر الدین، سید نذیر نیازی اور آل احمد سرور کے مضامین شامل ہیں۔

چراغ حسن حسرت کی مرتبہ ''اقبال نامہ'' میں مرتب کے معلوماتی دیباچے کے علاوہ علی بخش، مولانا سالک، حکیم قرشی، مولانا غلام رسول مہر، عاشق حسین بٹالوی، سید نذیر نیازی، احمد ندیم قاسمی اور تاثیر کے مضامین سے اقبال کے سوانحِ حیات کے کئی گوشے منور ہوتے ہیں۔ مجموعے کے آخر میں حسرت موہانی، حفیظ ہوشیارپوری، سراج الدین ظفر اور بشیر محمد کی اقبال کی وفات پر کہی گئی نظمیں شامل ہیں (۱۳)۔

علی بخش نے طویل عرصہ تک اقبال کی خدمت اور اس دوران ان کی حیات اور معمولات کے بارے میں اپنے جن مشاہدات سے چراغ حسن حسرت کو آگاہ کیا تھا، وہ حسرت کی ''حیاتِ اقبال'' (۱۹۳۸ء) کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال کی سوانح عمریاں

اقبال سوانح عمریوں کی اہمیت سے آگاہ تھے اور یورپ میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں پر ان کی نظر تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اردو میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں کی تعداد بہت کم ہے۔ شاید وہ اس طرح سے اپنے قریبی رفقاء کو یہ اشارہ دے رہے تھے کہ ان کی زندگی کے اہم حالات اور واقعات کو بھی ضبط تحریر میں لے آنا چاہئے جیسا کہ چراغ حسن حسرت نے ''اقبال نامہ'' کے دیباچے میں اقبال کے حوالے سے لکھا ہے:۔

> ''اگر کوئی خدا کا بندہ اس کام کا بیڑہ اٹھائے اور مسلمان فرمانرواؤں، عالموں، شاعروں اور ادیبوں کے حالات سیدھی سادی زبان میں اس طرح بیان کر دیئے جائیں کہ عام لوگ بھی انہیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھیں''(۱۴)۔

''اقبال نامہ'' میں شامل بیشتر مضامین مختصر ہیں لیکن ان سے اقبال کی حیات، ان کی شخصیت اور معمولات کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ضرور اجاگر ہوتا ہے جو اس سے پہلے عام قاری کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

طاہر فاروقی کی اقبال شناسی

اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھی جانے والی پروفیسر طاہر فاروقی کی ''سیرت اقبال'' (اشاعت ۱۹۳۹ء) کو عام معنوں میں ایک مکمل سوانح عمری تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اس کے پہلے حصے میں اقبال کے سوانح حیات کو ترتیب اور تفصیل سے تقریباً ۱۳۸ صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی شعری ونثری تصانیف کے مفصل تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے کلام سے اہم اقتباسات توضیح اور تبصرے کے ساتھ شامل ہیں۔

''سیرت اقبال'' کا دیباچہ پروفیسر حمید احمد خاں نے تحریر کیا جس میں پروفیسر فاروقی کے کام کو سراہتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔ ''پروفیسر صاحب نے ''اقبال بحیثیت انسان'' اور

''اقبال بحیثیت شاعر'' دونوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جو اقبال کے ایک جامع سیرت نگار کے لیے یقیناً ضروری تھا[۱۵]۔

پروفیسر فاروقی کا انداز عام فہم اور سلجھا ہوا ہے جس سے اقبالیات کا ہر سطح کا طالب علم استفادہ کر سکتا ہے۔ انہوں نے اقبال کے مشقِ سخن کے زمانے کے علاوہ ان کی شاعری کے چار ادوار کا تعین کرتے ہوئے ان کی خصوصیات شاعری پر تفصیلی بحث کی ہے۔

وہ اقبال کے تمام پیغام کو صرف ایک لفظ ''خودی'' میں مضمر بتاتے ہیں اور پھر اس کو شیطانی اور یزدانی خودی میں تقسیم کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شیطانی خودی وہ ہے جس کا نمونہ روز ازل شیطان نے معبود حقیقی کے حکم سے سرتابی کر کے پیش کیا تھا اور یہی خودی انسان کو شداد اور ہامان کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے اور ''خسر الدنیا و الاخرۃ'' کا مصداق بنا دیتی ہے جبکہ یزدانی خودی ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' کے مترادف ہے جو عارف خودی کو حقوق و فرائض زندگی سے آگاہ کر کے مردِ خدا بناتی ہے جو ایک طرف خلیفۃ اللہ فی الارض کا اہل ہوتا ہے تو دوسری طرف قرب الٰہی کا مستحق بھی قرار پاتا ہے۔ یہی خودی مقصد حیات اور تعلیم اسلام بھی ہے اور اقبال نے اسی خودی کی تعلیم کو پیش کیا ہے''[۱۶]۔

پروفیسر طاہر فاروقی نے ''سیرت اقبال'' اپنے آگرہ کالج کے قیام کے دوران لکھی۔ ۱۹۳۸ء ہی میں انہوں نے آگرہ میں ''بزم اقبال'' قائم کر کے اقبال کے ساتھ اپنی عقیدت کا عملی اظہار بھی کیا۔ ۱۹۶۶ء میں شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی کی جانب سے ''خیابانِ اقبال'' کی خصوصی اشاعت بھی ان کی اقبال کے ساتھ سچی لگن کا ایک ثبوت ہے۔ جشن اقبال صدی ۱۹۷۷ء کے موقع پر ان کی تصنیف ''اقبال اور محبتِ رسولؐ'' سامنے آئی جس میں اقبال کی زندگی، ان کے کلام اور دوسری تحریروں کی روشنی میں ان کی سیرت کے اس قابل قدر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ کس درجہ حب رسولؐ سے سرشار تھے۔ طاہر فاروقی کا ۱۹۷۸ء میں انتقال ہوا۔

چراغ حسن حسرتؔ کی مرتبہ ''اقبال نامہ'' میں ایسے مختصر مضامین شامل کئے گئے ہیں جو مختلف اصحاب نے اقبال کے حوالے سے قلمبند کئے ہیں جن میں اقبال کی شخصیت، کردار اور معمولات کے بارے میں ان کے مشاہدات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان مختصر مضامین کی ایک

اہمیت تو یہ ہے کہ ان سے اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلو روشن ہوتے ہیں اور دوسری یہ کہ یہی مختصر مضامین بعد میں اقبال کی سوانح عمریاں لکھنے کے محرک بھی ثابت ہوئے۔

مولانا عبدالمجید سالک کی ''ذکرِ اقبال''

''اقبال نامہ'' میں شامل اپنے مضمون میں' مولانا عبدالمجید سالک نے تیس سالوں پر پھیلی ہوئی علامہ کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اقبال کی شفقت اور قدم قدم پر حاصل ہونے والی ان کی رہنمائی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ علامہ کے ہاں منعقد ہونے والی اُن علمی مجالس کا بھی ذکر کیا ہے جس میں ہر خاص و عام کو شرکت کی اجازت تھی۔ ان مجالس میں علامہ جس طرح سے مختلف علمی' فکری اور مذہبی موضوعات پر عالمانہ گفتگو کرتے تھے ان کا نقشہ بھی مولانا نے اپنے والہانہ انداز میں کھینچا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اسی مختصر تحریر نے بعد میں ان کو اقبال کی ایک مکمل سوانح عمری لکھنے کے لئے تیار کیا جو ''ذکر اقبال'' کے عنوان سے ۱۹۵۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔

سات ابواب پر مشتمل اس سوانح عمری میں اقبال کی تعلیم و تربیت اور عملی زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہونے اور سفرِ آخرت پر روانہ ہونے تک کے مراحل کو اس چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس عہد میں سانس لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ بقیہ حصے میں اقبال کے طرز زندگی اور ان کے ارشادات کے کچھ نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں اقبال کی تصانیف پر تعارفی سطور لکھی گئی ہیں۔

یہ درست ہے کہ کتاب کی ابتداء میں' مولانا سالک نے یہ وضاحت کردی ہے کہ یہ کتاب اقبال کی محض سوانح عمری ہوگی جس میں ان کی شاعری اور فلسفے کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا (۱۷) اور وہ کتاب لکھتے ہوئے اس اصول پر قائم بھی رہے ہیں لیکن اقبال کی زندگی کے حالات اور ان کے ارشادت بیان کرتے ہوئے وہ بعض ایسے واقعات بھی بیان کر گئے ہیں جن سے ان کے فکر و فلسفہ پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

جیسے ''اقبال نامہ'' میں شامل مضمون میں بیان کردہ ایک واقعہ ''ذکرِ اقبال'' کے

صفحات میں بھی دہرایا گیا ہے جس میں اقبال کے تصور استحکام خودی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا نے واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار ایک درویش علامہ کے پاس آیا۔ آپ نے حسب عادت اس سے دعا کی درخواست کی۔ پوچھا ''دولت چاہتے ہو؟''۔ علامہ نے جواب دیا ''میں درویش ہوں، دولت کی ہوس نہیں''۔ پوچھا ''عزو جاہ مانگتے ہو؟''۔ جواب دیا ''وہ بھی خدا نے کافی بخش رکھی ہے''۔ پوچھا ''تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟''۔ جواب دیا ''سائیں جی' کیا کہہ رہے ہو' میں بندہ' وہ خدا۔ بندہ خدا سے کیونکر مل سکتا ہے؟ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا' نابود ہو جاتا ہے۔ میں قطرے کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں''۔ یہ سن کر درویش پر خاص کیفیت طاری ہوئی۔ بولا ''بابا جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا' تُو تو خود آگاہِ راز ہے' تجھے کسی کی دعا کی ضرورت نہیں ہے''[۱۸]۔

اقبال کے تصور عقل و عشق کی تفسیر و تنقید میں ناقدین اقبال نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ''ذکر اقبال'' میں سالک نے برقؔ کے حوالے سے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ علامہ سے سوال کیا گیا: ''عقل کی انتہا کیا ہے؟''۔ جواب دیا: ''حیرت''۔ سوال کیا گیا: ''عشق کی انتہا کی ہے؟''۔ فرمایا: ''عشق لا انتہا ہے''۔ مستفسر نے کہا: ''پھر آپ نے یہ لکھا ہے 'ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں''۔ مسکرا کر فرمانے لگے: ''دوسرا مصرع بھی تو پڑھیئے جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کیا ہے کہ 'مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں؟''[۱۹]۔

یعنی سوانح عمری محض حالات و واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ صاحب سوانح کے باطن میں جھانکنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے بشرطیکہ سوانح نگار حالات و واقعات و ارشادات کے انتخاب اور تفصیلات و جزئیات کی پیشکش میں طریقے اور سلیقے سے کام لے اور بلاشبہ ''ذکرِ اقبال'' کے صفحات میں یہ اہتمام نظر آتا ہے۔

سید نذیر نیازی

سید نذیر نیازی کو خاص طور پر اقبال کی زندگی کے آخری سالوں میں ان کے قریب رہنے کا موقع ملا جیسا کہ حسرتؔ نے بھی لکھا ہے کہ وہ ہر روز بلا ناغہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے' ان سے جو کچھ سنتے تھے' لکھ لیا کرتے تھے[۲۰]۔ لیکن انہوں نے کسی طویل مضمون کی

بجائے اپنے روزنامچہ کا ایک ورق اس مجموعہء مضامین کے لئے عطا کیا جس میں ۷ فروری ۱۹۳۸ء کا حال بیان کیا گیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی دوستوں اور نیازمندوں کے ساتھ ان کے مکالمے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس روز بھی خودی اور خدا کے حوالے سے ہونے والی گفتگو کو سید نذیر نیازی نے قلمبند کیا' جس سے اس مسئلے کے بعض دقیق پہلوؤں پر اقبال کے خیالات جاننے کا موقع ملتا ہے۔

سید نذیر نیازی کے روزنامچے کے بظاہر اس مختصر سے ورق سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ان کے سینے میں اقبال کی یادوں کا ایک جہاں آباد ہے اور ان کے پاس ایک ایسا علمی اسلوب بھی ہے جس کو بروئے کار لا کر ایک اعلیٰ پائے کی سوانح اقبال مکمل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سال اقبال ۱۹۷۷ء نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا جب ولادت اقبال کی صد سالہ تقریبات کے لئے قائم کمیٹی نے اقبال کی سوانح حیات لکھنے کی اہم ذمہ داری سید نذیر نیازی کو سونپی' جس کا عنوان ''دانائے راز'' بھی گویا بقول نیازی مرحوم آپ ہی آپ تجویز ہو گیا کہ اس کمیٹی کے پہلے اجلاس کی روئیداد کی پیشانی میں ''دانائے راز'' کا عنوان قائم تھا جسے اختیار کر لیا گیا[۲۱]۔ گویا سال اقبال کے لئے قائم کمیٹی کا نشان ہی اس سوانح حیات کا عنوان بن گیا۔

یہ درست ہے کہ سوانح اقبال کے اس طویل اور ضخیم منصوبے کا جو خاکہ سید صاحب کے ذہن میں موجود تھا وہ اسی انداز میں اور اسی سال اقبال میں پایہء تکمیل کو نہ پہنچ سکا لیکن یہ امر باعث اطمینان ضرور ہے کہ حیات اقبال کے ایک اہم دور کی تفصیلات ضرور محفوظ ہو گئیں۔

سوانح اقبال کی مزید مثالیں

عاشق حسین بٹالوی کو بھی برسوں اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ انہیں یادوں کے حوالے سے ''اقبال نامہ'' میں ان کا ایک مختصر مضمون ''علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے'' کے عنوان سے شامل ہے۔ بعد کے سالوں میں ان کی تصانیف ''اقبال اور تحریک پاکستان'' (۱۹۶۷) اور ''اقبال کے آخری دو سال'' (۱۹۶۹ء) شائع ہوئیں۔

فقیر سید وحید الدین نے شاعر مشرق کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کے تاثرات ایک امانت

کی طرح ''روزگارِفقیر'' کے دوحصوں میں منتقل کر کے شائع کیۓ۔

حمید احمد خان

حمید احمد خان کی تصنیف ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین میں اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے(۲۲)۔

محمود نظامی کو' ملفوظات اقبال' مرتب کرنے کا موقع ملا جبکہ مکاتیب اقبال کے بھی متعدد مجموعے شائع ہوۓ جن کو کلیات کی صورت میں بھی مرتب کیا جا چکا ہے۔ محمد رفیق افضل نے اقبال کی تقاریر' اخباری بیانات (روزنامہ زمیندار' روزنامہ انقلاب) وغیرہ پر مشتمل مواد کو تاریخی ترتیب سے ''گفتار اقبال'' کی صورت میں مرتب کیا جو مرتب کے نزدیک:۔

''نہ صرف علامہ اقبال کے مستند سوانح حیات لکھنے کے لیے
بلکہ پنجاب اور تحریک آزادی کی تاریخ کی ترتیب کے لئے
بے حد ضروری ہے''(۲۳)۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو ۱۹۱۴ء کے آخر سے اقبال کے قریب ہونے کا موقع ملا اور پھر ۱۹۲۳ء سے لے کر ان کی رحلت تک سفر وحضر میں ان کے ہمراہ رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اسی وجہ سے بقول ان کے انہوں نے اپنی تالیف کا نام ''اقبال کی صحبت میں'' رکھا جو سال اقبال ۱۹۷۷ء کے موقع پر شائع ہوئی(۲۴)۔

جشن اقبال صدی' پاکستان میں

اقبال کے جشن صدی کے سلسلے میں قائم کی جانے والی مرکزی اقبال کمیٹی نے سوانح اقبال پر مبنی کتب مرتب کروانے کا فیصلہ بھی کیا تھا اور اس سلسلے میں ایک ذمہ داری ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو بھی سونپی گئی تھی جنھوں نے ''سرگزشتِ اقبال'' مرتب کر کے یہ ذمہ داری نبھانے کی کوشش کی۔

سال اقبال کے موقع پر شائع ہونے والی اس تصنیف کی ادبی و سوانحی قدر و قیمت کے بارے میں کئی سوالات بھی اٹھائے گئے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تند و تیز تنقید میں اس کو سرے سے سوانحی تصنیف ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کے نزدیک اس میں خارجی حالات اور صحافتی معلومات کا اتنا طومار ہے کہ شخصیت ان میں دب کر رہ گئی ہے اور جہاں شخصی حالات آئے بھی ہیں، وہاں سالکؔ، نذیر نیازی اور دوسرے مصنفین کے بیانات کا سہارا لینے پر اکتفا کیا گیا ہے(۲۵)۔

''سرگزشتِ اقبال'' کے اڑتیس ابواب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ سوانح نگار نے ابواب بندی کرتے وقت بڑی ''فراخ دلی'' کا ثبوت فراہم کیا ہے جو بڑی حد تک غیر ضروری ہے کیونکہ اقبال کے حالات، خیالات اور خدمات کو محض پانچ یا سات ابواب میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ تقسیم کیا جا سکتا تھا، جبکہ مؤلف نے اقبال کی حیات، خیالات اور خدمات کے تحت بیان کئے گئے ایک ایک عنوانات کے لئے ایک ایک مکمل باب وقف کیا ہے۔ مجموعی طور پر حیات اقبال کے سیاسی تناظر کو واضح کرنے پر زور دیا گیا ہے اور اس ضمن میں بھی زیادہ تر روزنامہ ''انقلاب'' وغیرہ کے فائلوں (۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۸ء تک) کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس سے حیات اقبال کے دیگر پہلو نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔

اقبال کی ابتدائی زندگی

ڈاکٹر سلطان محمود حسین نے اقبال کی زندگی کے ابتدائی سالوں (پیدائش تا ۱۸۹۵ء) تک کے حالات اور ان سے متعلق مختلف دستاویزات کے حصول کے لئے کٹھن مراحل سے گزر کر ''اقبال کی ابتدائی زندگی'' مرتب کی جس کے لئے سنی سنائی باتوں پر انحصار کرنے کی بجائے انہوں نے اصل ماخذوں کو بنیاد بنایا(۲۶)۔

حال ہی میں ڈاکٹر سلطان محمود حسین نے ''حیات اقبال کے آخری چوالیس سال'' مکمل کی ہے جس میں ۱۸۹۵ء سے اقبال کی وفات ۱۹۳۸ء تک کے حالات پر مشتمل تحقیقی مواد پیش کیا گیا ہے(۲۷)۔

اقبال کی جامع سوانح عمری، زندہ رود

لیکن سوانح اقبال کے سلسلہ میں فرزند اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال کا جامع تحقیقی منصوبہ جو ''زندہ رود'' کی تین جلدوں میں تکمیل کو پہنچا بلاشبہ ایک کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ اقبال کی شخصیت، شاعری، فکر اور فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن سوانح عمری کے طور پر جو کتابیں تحریر کی گئی ہیں وہ نسبتاً کم بھی ہیں اور ان میں پیش کردہ تفصیلات بھی ناکافی ہیں۔ حتیٰ کہ سال اقبال کے دوران بھی اس موضوع پر شائع ہونے والی کتابیں اس تشنگی کو دور نہیں کر سکیں۔ لہٰذا یہی احساس ''زندہ رود'' لکھنے کا محرک ثابت ہوا(۲۸)۔

اقبال کی سوانح عمری لکھنے سے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس نقطہء نظر کا اظہار کیا کہ اس کتاب میں افکار اقبال کے تدریجی ارتقاء اور ان کے ماحول پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جبکہ ذاتی حالات کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب محض سوانح اقبال ہی نہیں بلکہ عہد اقبال کی تاریخ بھی ہے(۲۹)۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے دعویٰ کا ثبوت ''زندہ رود'' کی تینوں جلدوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جن کو حیات اقبال کے تشکیلی دور، وسطی دور اور اختتامی دور میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کی سوانح عمری کے لئے ''زندہ رود'' کا عنوان ہی کیوں انتخاب کیا؟ اس کی توجیہہ بھی انہوں نے پیش لفظ میں کر دی ہے کہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' کے روحانی سفر کے لئے اپنے لئے ''زندہ رود'' کا نام ہی منتخب کیا تھا جس کے معنی ایک مسلسل رواں دواں حیات آفریں ندی کے ہوتے ہیں اور حقیقت میں اقبال کی حیات بھی دراصل ان کی فکری زندگی کا ارتقاء ہے جو ایک مستقل حال میں جاری وساری ہے۔ اس لئے حیات اقبال کو زندہ رود کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے(۳۰)۔

''زندہ رود'' کی جلد اول کو اقبال کی حیات کے تشکیلی دور کا نام دیا گیا ہے جس میں

ان کی تعلیمی تکمیل کے مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کے سلسلہء اجداد پر تفصیلی بحث کے علاوہ ان کی تاریخ ولادت کے مسئلہ کا بھی تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال کی ابتدائی زندگی کے اہم واقعات' گورنمنٹ کالج لاہور اور یورپ میں ان کے تعلیمی سلسلہ کی تفصیلات اور بالخصوص ان کے ذہنی ارتقاء پر قیام یورپ کے اثرات پر بحث ملتی ہے۔

''زندہ رود'' کی دوسری جلد حیات اقبال کے وسطی دور کا احاطہ کرتی ہے جس میں خاص طور پر مثنوی اسرار خودی کی اشاعت اور اس حوالے سے شروع ہونے والے طویل مباحث کو پیش کیا گیا ہے۔

''زندہ رود'' کی تیسری اور طویل ترین جلد کو حیات اقبال کے اختتامی دور کا ذیلی عنوان دیا گیا ہے جس میں اقبال کی سیاسی زندگی کے مختلف مراحل کا بیان ہے جو بالآخر ان کی وفات پر منتج ہوتا ہے اور بقول سوانح نگار:۔

> ''اس دور میں اقبال کی شخصیت کے کئی نئے پہلو ظاہر ہوئے۔ وہ احیائے اسلام اور مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کی سمت کی تعین کے بارے میں اپنے دینی' سیاسی' اخلاقی' قانونی' تمدنی' معاشی اور الہیاتی خیالات کو مخالفین کی پرواہ کیے بغیر ترتیب دیتے چلے گئے۔ مگر بالآخر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر عجب بے چینی' بے تابی اور بے قراری کے عالم میں وفات پائی''(۳۱)۔

اقبال کی اس سوانح حیات پر کام کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا تھا جو نو برس کی طویل محنت کے بعد ۱۹۸۴ء میں تکمیل کو پہنچا لیکن جس کی جامعیت اور جرأت تحقیق کا اعتراف اقبال شناس حلقوں میں کھلے دل کے ساتھ کیا گیا۔ خاص طور پر سوانح نگار نے اقبال کی زندگی کے حوالے سے پھیلائی جانے والی بعض غلط فہمیوں کی وضاحت کے لئے جس تحقیقی شعور سے کام لیا ہے وہ بجا طور پر قابل ذکر ہے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نے ''زندہ رود'' کے اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تبصرے میں لکھا:۔

''ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے پاؤں کے چھالوں میں بہت
سے کانٹے پڑے تھے۔ ان کو ان کے فرزند ارجمند نے نوکِ
سوزن سے نکالا ہے''۔ (۳۲)

اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر جاوید اقبال محض فرزند اقبال ہونے کی حیثیت سے اہم نہیں ہیں بلکہ جس تسلسل کے ساتھ انہوں نے تحریری اور تقریری سطح پر اقبال کی حیات اور ان کے افکار کو موضوع بنائے رکھا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ انہوں نے ''اقبال۔ ایک باپ کی حیثیت سے'' کے عنوان سے ریڈیو سٹیشن لاہور کے لئے ایک مضمون تحریر کیا جو ۲۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو یوم اقبال کے موقع پر نشر ہوا اور بعد میں ان کے مجموعہ مضامین ''مئے لالہ فام'' میں بھی دوسرے مضامین کے ساتھ شامل ہے۔ اقبال کے حوالے سے ان کی یادیں بھی مرتب کی گئیں جنہیں تنویر ظہور نے ۱۹۹۰ء میں کتابی شکل دی۔

''زندہ رود'' جیسی مبسوط سوانح عمری کا تذکرہ ہو چکا ہے جس کی کچھ جھلکیاں خود ڈاکٹر جاوید اقبال کی اپنی خودنوشت ''اپنا گریباں چاک'' میں بھی نظر آتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اقبال کے حوالے سے منعقد ہونے والی مختلف کانفرنسوں میں پیش کئے جانے والے سینکڑوں مقالات و خطبات کو سامنے رکھا جائے تو ایک اقبال شناس کے طور پر ان کی منفرد حیثیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

○

عطیہ بیگم کی ''اقبال''، ڈورس احمد کی ''جیسا میں نے اقبال کو دیکھا'' (انگریزی)، صابر کلوروی کی ''یادِ اقبال''، شیخ اعجاز احمد ''مظلوم اقبال'' اور خالد نظیر صوفی کی ''اقبال درون خانہ'' میں بھی اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کو یکجا کیا گیا ہے۔

فکریاتِ اقبال

اقبالیات میں حیات اقبال کے بعد بنیادی اہمیت یقیناً فکریاتِ اقبال ہی کو حاصل ہے اور سب سے زیادہ اسی پہلو کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔ فکریاتِ اقبال کا دائرہ وسیع ہے جو

دینی، سیاسی، صوفیانہ اور فلسفیانہ فکر پر محیط ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین و محققین اقبالیات نے اپنی فکر و نظر کے حوالے سے تفہیم افکارِ اقبال کی سعی کی ہے جس کے نتیجے میں بعض اوقات اشکالات اور تضادات کی صورت بھی پیدا ہوئی ہے جو بعض صورتوں میں ناگزیر نظر آتی ہے کہ مذہبی مبلغین و متکلمین، ترقی پسند اور مارکسی دانشوروں کے علاوہ اعتدال پسند شارحین و ماہرین اقبالیات کی فکرِ اقبال کے ساتھ وابستگی، اقبال کی زندہ، متحرک اور ہمہ گیر سوچ کی مظہر ہے جو بتدریج وسعت پذیر بھی ہے اور اس امر کی دلیل بھی کہ جمالِ اقبال ضرور نکھر کر اپنی صحیح صورت میں سامنے آتا چلا جائے گا۔

پاکستان میں فکریاتِ اقبال کو موضوع بنانے والوں کے طویل سلسلے میں سے صرف چند اہم اقبال شناسوں کی کاوشوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ممکن ہے بالخصوص جن سے اقبال شناسی کی روایت کو وسعت، تنوع اور تازگی نصیب ہوئی یا پھر جس سے کسی نئے رجحان کا اشارہ ملتا ہے۔

برصغیر میں اقبال شناسی کی روایت میں جامعہ عثمانیہ کا کردار اس لحاظ سے اہم بھی ہے اور بے مثال بھی کہ اس ادارے میں اقبال شناسوں کا ایک ایسا جھرمٹ وجود میں آیا جس نے اقبالیات میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ ان میں سے بعض اہم ہستیوں کا تذکرہ بھارت میں اقبال شناسی کے ضمن میں ہو چکا ہے لیکن جو پروفیسر عزیز احمد، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے اسمائے گرامی اور ان کی اقبالیاتی خدمات کے جائزے کے بعد ہی مکمل کہلا سکتا ہے۔

پروفیسر عزیز احمد

حیدر آباد (دکن) سے تعلق رکھنے والے عزیز احمد نے جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۳۴ء اور بعد ازاں لندن یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں انگریزی زبان و ادب میں بی۔اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ لندن یونیورسٹی کی طرف سے ان کی علمی و تواریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۷۲ء میں ان کو ڈی۔لٹ کی (اعزازی) ڈگری عطا کی گئی۔

وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہء انگریزی کے ساتھ' لیکچرر' ریڈر اور پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے آئے اور محکمہ تعلقات عامہ میں وزارت امور کشمیر کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کے شعبہء اردو کے ساتھ وابستہ ہو کر لندن چلے گئے۔ ۱۹۶۲ء سے اپنی وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء تک ٹورنٹو یونیورسٹی (کینیڈا) کے شعبہ اسلامیات میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ وہ وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔

عزیز احمد کو اردو' فارسی' انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا جبکہ ترکی' اطالوی اور جرمن زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اس کے علاوہ عربی زبان کی بھی واقفیت حاصل تھی۔ ان کی تخلیقات وتالیفات' خطبات اور تحقیقات وتراجم کی طویل فہرست موجود ہے۔ اقبال کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں میں ''اقبال نئی تشکیل'' (۱۹۵۰ء) اور ''اقبال اور پاکستانی ادب'' (مرتبہ طاہر تونسوی) طبع اول (۱۹۷۷ء) کے علاوہ انہوں نے اقبال کے فکروفن پر اردو' انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بھی مقالات لکھے جو مختلف علمی ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔ (۳۳)

عزیز احمد کی ''اقبال نئی تشکیل'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ ہمارے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور جس میں عزیز احمد کے ایک مضمون ''اقبال کا نظریہء فن'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔

افکار اقبال کے حوالے سے لکھی جانے والی یہ اہم کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین ابواب میں بالترتیب وطن پرستی کا دور' اسلامی شاعری کا دور اور انقلابی شاعری کا دور زیر بحث لایا گیا ہے جبکہ چوتھے اور آخری باب میں اقبال کے نظریہء فن پر مدلل بحث کی گئی ہے۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں اس کتاب کی ابتدائی سطور قلمبند کرتے ہوئے عزیز احمد کو قیام پاکستان کی ناگزیر حقیقت کا احساس ہو چکا تھا اور وہ اس کو یقینی طور پر اقبال کی حکمت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اقرار کرتے ہیں:۔

''۱۹۳۰ء میں انہوں (اقبال) نے جو مسئلہ چھیڑا تھا وہ آج
نہ صرف ہندوستان بلکہ شاید پورے ایشیاء کا سب سے اہم
اور سب سے پیچیدہ مسئلہ بن چکا ہے۔ تاریخ اس کا فیصلہ
کرے گی کہ اقبال کا تجزیہ اور ان کا حل مسلمانوں'
ہندوستانیوں اور انسانوں کے لئے کس حد تک مفید تھا اور کس
حد تک مضر''(۳۴)۔

برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک دور میں اقبال پر کتاب لکھتے ہوئے انہیں احساس ہے کہ کوئی اور مثال ایسی نہیں ہے کہ کسی شاعر نے کسی قوم کے مستقبل پر ایسا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہو اور پھر اس شاعر کو پڑھنے اور پھر اس پر لکھنے کے لئے صرف اس شاعر کا کلام پڑھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے اطراف بہت کچھ پڑھنا ضروری ہے جیسے مشرق و مغرب کا قدیم و جدید فلسفہ اور اردو اور فارسی شعر و ادب کے علاوہ جرمن' اطالوی' انگریزی شاعری کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے(۳۵)۔

وہ اقبال کے تفکر کی ہمہ گیری اور اس سے وابستہ دیگر مشکلات سے آگاہ ہیں جو اقبال پر لکھنے والے کسی بھی اسکالر کے راستے میں حائل ہو سکتی ہیں لیکن اس مسئلہ کا قابلِ اطمینان پہلو یہ ہے کہ عزیز احمد ان تمام معیارات اور شرائط پر پورا اترنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں جو انہوں نے از خود ابتداء میں قائم کی ہیں۔

پروفیسر عزیز احمد کی تصنیف ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' (اردو ترجمہ' ڈاکٹر جمیل جالبی) کے ابواب: ''اقبال: مفکرانہ نو جدیدیت'' اور ''تخلیق پاکستان'' میں بھی بالترتیب اقبال کے مذہب' تفکر اور اقبال کے نظریہء پاکستان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے(۳۶)۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بین الاقوامی سطح پر ایک ریاضی دان کے طور پہ شہرت حاصل کی لیکن اس کے علاوہ انہوں نے تعلیم اور ادب کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ایک اقبال

شناس کی حیثیت سے انہوں نے ''اقبال کا تصور زمان ومکان اور دوسرے مضامین'' جیسے مجموعے کے ذریعے افکار اقبال کی سائنسی جہات پر روشنی ڈالی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد کیمبرج سے ریاضی میں Tripos حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں لیپزگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے والے رضی الدین کو اردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ عربی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی۔ پروفیسر نظیر صدیقی کے مطابق:۔

> ''انہوں نے برطانیہ، فرانس، جرمنی اور ہندوستان کے بہت سے بین الاقوامی رسالوں میں ریاضیاتی موضوعات پر تحقیقی مقالات شائع کئے تھے۔ ایک زمانے میں ان کے نوبل پرائز پانے کے امکان کی افواہ بھی تھی''(۳۷)۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آنریری پروفیسر کے طور پر فرائض ادا کرتے رہے۔ وہ قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد میں پروفیسر ایمریطس کے منصب پر بھی فائز رہے۔

اقبال کی شاعری اور افکار کے ساتھ ان کے خصوصی لگاؤ کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کلام اقبال ان کو اس وقت بھی ازبر تھا جب وہ ابھی باقاعدہ طور پر کتابی شکل میں مرتب بھی نہیں ہوا تھا اور وہ احباب کے اصرار پر نجی محفلوں میں کلام اقبال سنایا کرتے تھے(۳۸)۔

''اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین'' میں شامل نو مضامین میں سے سات اردو اور دو انگریزی زبان میں ہیں اور یہ مختلف موقعوں پر مجالس اقبال میں پڑھے جانے والے مضامین تھے جن کو مجموعے کی صورت دی گئی ہے۔

اقبال کے ایک مداح ہونے کے علاوہ انہوں نے ایک سائنس دان کی حیثیت سے بھی افکار اقبال کے سائنسی پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ:۔

''اقبال کے منظوم کلام اور خاص طور پر خطبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جدید سائنس خصوصاً طبیعات' حیاتیات اور نفسیات کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا اور مذہب' فلسفہ اور علم کلام پر جدید سائنس کے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے' ان سے بخوبی واقف تھے''(۳۹)۔

یہ سائنسی تناظر مجموعے میں شامل بالخصوص دو مضامین :۔

ا۔ اقبال کا تصور زمان و مکان

ب۔ مذہب اور سائنس اقبال کی نظر میں

کے مطالعے کے دوران واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے گو کہ اقبال کے عام قاری کے لئے یہ مباحث بہت بوجھل اور دقیق ہیں لیکن اس سے اقبال شناسی کے حوالے سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس وسیع علمی روایت میں ادبی ناقدین اور محققین کے علاوہ مفکرین اور سائنس دانوں کا بھی قابل قدر حصہ ہے۔

''اقبال کا تصور زمان و مکان' ڈاکٹر رضی الدین کا وہ مضمون ہے جس کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۹۴۳ء میں یوم اقبال کے موقع پر لاہور میں پڑھا گیا۔ پھر ایک مجموعہء مضامین "Iqbal As a Thinker" میں بھی شامل کیا گیا۔ علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کو بے حد سراہا گیا۔ سید عبدالواحد نے بجا طور پر لکھا کہ:۔

''یہ تمام عقیدتمندان اقبال کی خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر یہ مضمون لکھا جس پر وہی لکھ سکتے تھے''(۴۰)۔

ڈاکٹر صدیقی نے اقبال کے تصور زمان و مکان کی وضاحت کے لئے اقبال کے اردو' فارسی کلام کے علاوہ ان کے خطبات کو بھی بنیاد بنایا ہے اور اس مسئلہ کی تفہیم کے لئے پس منظر کے طور پر اہل یونان' علمائے اسلام کے مختلف مکاتب فکر' جدید فلسفیانہ اور سائنسی تصورات بالخصوص آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کا بھی جائزہ لیا ہے اور اپنے نتائج فکر پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''قرآن کریم کے تصور کے منافی اس سے زیادہ کوئی تصور
نہیں ہوسکتا کہ کائنات سوائے ایک بنے بنائے نقشے کے کچھ
نہیں، جس کے مطابق کام ہو رہا ہو۔ قرآن کی تعلیم کے
مطابق کائنات حرکیاتی ہے۔ یہ ایک ہر دم تشکیل پانے والی
کائنات ہے نہ کہ ایک مکمل چیز جو اپنے خالق کے ہاتھوں
سے بہت عرصہ پہلے نکلی تھی اور اب فضا میں مادے کے ایک
بے جان ڈلے کی طرح ہر طرف پھیلی پڑی ہے جس پر وقت
گزرنے کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ خود ہم کو وقت کے تواتر کا جو
احساس ہوتا ہے اس سے قبل اقبال نے حقیقتِ آخری کا
ایک تصور حاصل کیا ہے جس میں خیال، زندگی اور ارادہ ایک
دوسرے سے ترکیب پا کر ایک عضوی وحدت بن جاتے
ہیں۔ غرض زماں یا وقت اس حقیقت آخری کا ایک لازمی
جزو ہے''(۴۱)۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا نام ایک ایسے عالی دماغ اور روشن خیال مفسر و مفکرِ اقبال کے طور پر جانا جاتا ہے جو یقیناً اپنی مثال آپ ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم شاعر بھی ہیں۔ ان کا کلام ''کلامِ حکیم'' کے عنوان سے مرتب ہو چکا ہے۔ فلسفہ دان ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۵ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں جرمنی سے "Metaphysics Of Rumi" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور یہی نہیں، اقبال کی طرح حکمتِ رومی کے گہرے شناور بھی ہیں۔ اقبال نے فکر اسلامی کی تشکیل نو جیسے اہم عصری مسئلہ کی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے جس کام کا آغاز کیا تھا خلیفہ عبدالحکیم نے اُسے آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ "Islam And Communism", "Islamic Ideology" اور سیرت النبیؐ پر انگریزی میں ایک اہم تصنیف کے علاوہ بعض اہم

مقالات اس کا زندہ ثبوت ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم جرمنی سے ڈاکٹریٹ کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہء فلسفہ مقرر ہوئے اور ۱۹۴۳ء تک اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد امر سنگھ کالج' سری نگر میں کچھ سالوں تک بطور پرنسپل کام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد مستقلاً لاہور میں مقیم ہو گئے اور ۱۹۵۰ء میں اپنی زندگی کے ایک اہم منصوبہ کو اس وقت کے گورنر جنرل پاکستان' غلام محمد کے تعاون سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے قیام کی صورت میں تکمیل تک پہنچایا۔ خلیفہ عبدالحکیم اس کے پہلے اکیڈمک ڈائریکٹر مقرر ہوئے کہ بقول مولانا محمد حنیف ندوی ''وہی اس منصب کے لیے موزوں بھی تھے''(۴۲)۔

خلیفہ صاحب نے اس ادارے کے مقاصد کے حصول کے لئے جن اہل علم اصحاب کا انتخاب کیا ان میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی شامل تھے جو "Ideology Of the Future" لکھ کر اپنی علمی حیثیت منوا چکے تھے۔ دوسرے رفقاء میں مولانا مظہر الدین صدیقی' خواجہ عباد اللہ اختر' مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی' بشیر احمد ڈار' مولانا رئیس احمد جعفری اور مولانا محمد حنیف ندوی کے نام شامل ہیں۔

خلیفہ صاحب نہ صرف خود اس علمی جریدے میں باقاعدگی سے لکھتے رہے بلکہ اپنے رفقاء سے بھی عصری مسائل پر بہ اصرار لکھواتے رہے۔ اپنی وفات ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء تک خلیفہ صاحب اس علمی ادارے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر چکے تھے۔

خلیفہ عبدالحکیم کے علمی موضوعات کا دائرہ وسیع تھا لیکن ادبیات میں انہوں نے مولانا جلال الدین رومی' مرزا غالب اور علامہ اقبال کو بطور خاص اپنا موضوع تحقیق بنایا۔ ان کے رفیق کار مولانا حنیف ندوی کا خیال ہے کہ انہوں نے رومی' غالب اور اقبال کو اس فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ پہلی دفعہ اردو داں حضرات کما حقہ ان کی فکری عظمت سے روشناس ہو سکے(۴۳)۔

مولانا کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا ہے وہ بلند علمی سطح کا حامل ہے جس کا آغاز اقبال کی وفات

کے بعد انجمن ترقی اردو کے ماہنامے کے اقبال نمبر میں شامل ان کے مضمون بعنوان ''رومی' نطشے اور اقبال'' ہی سے ہو جاتا ہے اور جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہونے والی ان کی تصنیف ''فکر اقبال'' میں اپنی منتہا کو پہنچتا ہے (۴۴)۔ جس کی وقیع علمی حیثیت کا اعتراف کیا جاتا ہے اور جس کا ایک بڑا سبب اقبال اور حکیم کے درمیان پائی جانے والی علمی مماثلتوں کو بھی قرار دیا جاتا ہے' جس طرح کہ پروفیسر عثمان نے لکھا ہے:۔

''چونکہ خلیفہ کو ان سب علوم اور قلبی واردات سے گہرا تعلق تھا جو کلام اقبال میں منظر مہیا کرتے ہیں لہٰذا یہ قدرتی امر تھا کہ وہ اقبال کے بہترین شارح اور مفسر ثابت ہوئے۔ ''فکر اقبال'' اپنی جامعیت' اپنے مصنف کی عمیق نظر اور اقبال کے ساتھ دیانت اور وفا کے باعث اور سلیس و دلنشین اسلوب نگارش کی بدولت اقبال پر نہایت وقیع کتاب ہے''(۴۵)۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کی وفات پر لکھے جانے والے ۲۶ بند کے مرثیہ کو ''فکر اقبال'' میں شامل کیا ہے جو اقبال کے ساتھ حکیم کی عقیدت اور وابستگی کا مظہر ہے اور جس کی ابتداء درج ذیل بند سے ہوتی ہے:۔

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ
دل تھا ترا اسرار و معارف کا دفینہ
ہر شعر ترا بام ترقی کا ہے زینہ
مانندِ مہ نو تھا فلک پر سفینہ
اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز
کیا عرش سے ٹکرائی ہے انسان کی آواز (۴۶)

اقبال کے شعر و فکر کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر حکیم نے ''فکر اقبال'' میں مدلل اور مفصل بحث نہ کی ہو۔ اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار کے تفصیل جائزے کے بعد اس کے تصور

اسلام' تنقید مغرب' اشتراکیت' جمہوریت' عقل وعشق' اسرار خودی' رموز بے خودی پر تبصرہ وتجزیہ کیا گیا ہے اور آخر میں خطبات اقبال کا خلاصہ بھی پیش کر دیا گیا ہے جو افکار اقبال کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے اور جس کا فہم حاصل کئے بغیر افکار اقبال کی تفہیم ممکن نہیں۔

''فکر اقبال'' سے پہلے اقبال کی حیات اور فکر سے متعلق کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''روح اقبال'' اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' کی علمیت اور جامعیت کا اعتراف خود خلیفہ صاحب نے ''فکر اقبال'' کی تمہید میں کیا ہے لیکن انہوں نے اپنے پیش رو اقبال شناسوں کے حاصلاتِ فکر کو دہرایا نہیں بلکہ انہوں نے جس اقبال کو دریافت کیا ہے وہ ان کے اپنے شعورِ تحقیق کا نتیجہ ہے۔

حکیم کے نزدیک اقبال مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی شعور کا وہ جزو لاینفک ہے جو ملت اسلامیہ کے ساتھ ابدقرار ہو گیا ہے [۴۷]۔لیکن وہ اس کی فکر کے بعض پہلوؤں کے ساتھ واضح اختلاف کا اظہار بھی کرتے ہیں جیسے ان کا خیال ہے کہ فرنگ کے متعلق اقبال کی بیزاری اس کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیتی ہے اور خلق خدا کی بھلائی کے لئے زندگیاں وقف کرنے والے لوگ اقبال کو فرنگ میں کیوں نظر نہیں آتے [۴۸]۔ یا پھر یہ کہ اقبال نے افلاطون کے ساتھ انصاف نہیں کیا کیونکہ مارکس' لینن' مسولینی اور ہٹلر جیسے معاشرتی انقلاب کے آرزومند اور اپنے عمل سے دنیا کو تہ و بالا کرنے والے' خواہ اس کا نتیجہ تخریب ہو یا تعمیر افلاطون ہی کی کتاب سے کچھ کچھ ورق اڑاتے رہے ہیں [۴۹]۔حکیم کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ جس قسم کا انقلاب روس میں ہوا' اس سے ملتا جلتا انقلاب' اقبال ملت اسلامیہ میں بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کا محرک اسلام ہونا چاہئے نہ کہ الحاد بلکہ توحید ہی اس انقلاب کا محرک ہو [۵۰]۔

خلیفہ عبدالحکیم کے خیالات پر سخت تنقید بھی کی گئی لیکن دوسری طرف ان کو نہ صرف اقبال کی فکر کی توسیع قرار دیا گیا بلکہ ڈاکٹر وحید عشرت نے اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے عمرانی تصورات کا تقابل کرتے ہوئے اقبال کے فلسفے کے رجحان کو نظری جبکہ خلیفہ عبدالحکیم کے فلسفے کو عملی قرار دیا کیونکہ اقبال کا عہد مسلمانوں کی غلامی کا دور تھا اور ان کا مقصد ملت اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ تھا۔ان کے سامنے کوئی ٹھوس اسلامی ریاست موجود نہ تھی اور نہ اس ریاست کو درپیش

مسائل ان کی نگاہ میں تھے جبکہ حکیم کے سامنے مسلمانوں کی ایک ٹھوس اور محسوس آزاد ریاست کے مسائل تھے، حکیم نے جن کا ادراک کیا اور اس ریاست کے عمرانی مسائل کو پیش نظر رکھ کر تجریدات سے زیادہ ٹھوس حقائق سے بحث کی (۵۱)۔

○

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے تصور انقلاب کے حوالے سے جو کچھ لکھا، پروفیسر عثمان نے اُسے آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کے معاشی افکار کی وضاحت بھی کی اور اشتراکی انقلاب سے متعلق ان کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ثابت کیا کہ نہ صرف انہوں نے ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کا ایک خاص جوش اور شاعرانہ خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا بلکہ اس کی بدولت اقبال کے معاشی شعور میں مزید گہرائی اور نظر پیدا ہوئی۔ اشتراکی انقلاب اور قائدین انقلاب کے بارے میں اقبال کا انداز نظر اتفاق اور اختلاف کا بے مثل امتزاج تھا جو پاکستان کا نہایت قیمتی ورثہ ہے جس سے فیض اور فائدہ نہ اٹھانا ہماری بہت بڑی محرومی اور غلطی ہوگی (۵۲)۔

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد کے نزدیک اقبال محض ایک شاعر، عالم اور مفکر ہی نہیں تھے بلک ان کے لئے وہ ایک ایسے مرشد بھی تھے جن کی خدمت میں ان کو حاضری دینے اور فیض حاصل کرنے کے مواقع نصیب ہوئے جیسا کہ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ مولانا صلاح الدین احمد کی حیثیت اقبال کے حیات شناس کی نہیں بلکہ ایک ایسے رمز شناس کی تھی جنہوں نے نہ صرف عہد اقبال کا مطالعہ کیا تھا بلکہ اپنی زندگی کے اولین ۳۵ سال بھی اسی عہد میں بسر کئے تھے (۵۳)۔

وہ اقبال کے تصور کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت کے ہر فرد کو پیام اقبال سے سرشار دیکھنے کے متمنی تھے جو بلند نظری، جفاکشی، خودداری اور ایثار کا نمونہ ہو اور جو اپنی زندگی پر فخر کر سکے۔

مولانا شروع ہی سے کلام اقبال کی حقیقتوں کے شناسا تھے اور ہمہ وقت اسی میں

ڈوبے نظر آتے تھے جس کا اظہار انہوں نے ایک واقعے کی صورت میں کیا ہے:۔

''کوئی چالیس، بیالیس برس کی بات ہے، میں اور میرے عزیز ترین دوست منصور احمد مرحوم ہر شام کنارِ راوی تک جاتے اور راستہ بھر کلام اقبال ہی زیادہ تر موضوع سخن رہتا۔ انہی دنوں سوء اتفاق سے ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اس شام میں نے منصور مرحوم سے کہا کہ کاش پریم پرکاش اقبال اور گفتہء اقبال سے آشنا ہوتا، پھر وہ خودکشی کبھی نہ کرتا۔ آپ جانتے ہیں مرحوم نے اس کا کیا جواب دیا؟ کہنے لگے کہ میں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ جن لاکھوں لوگوں کی زندگی میں شعر اقبال کو دخل نہیں ہے وہ زندہ کیوں ہیں اور خودکشی کیوں نہیں کر لیتے؟'' (۵۴)۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کے اساسی تصورات پر کئی اہم مقالات قلمبند کیے جو ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقدمے کے ساتھ ''تصورات اقبال'' کی صورت میں شائع ہوئے۔ سید صاحب نے اقبالیات کے ساتھ مولانا کی وابستگی اور ان کی مطالعہ اقبال کی وسعت اور گہرائی اور کلام اقبال کی جیسی معرفت انہیں حاصل تھی اسی کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ انہیں اس امر پر پوری قدرت حاصل تھی کہ کسی مسئلہ خاص پر اقبال کے پورے کلام سے استشہاد کر سکیں (۵۵)۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

مولانا صلاح الدین احمد کی اقبال شناسی کی جن اہم خصوصیات کی نشاندہی ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی ہے، وہ بذات خود بھی ان سے بہرہ ور ہیں جس کا ثبوت اقبال کے حوالے سے لکھی جانے والی ان کی تصنیفات و تالیفات ''مسائل اقبال''، ''مقاصد اقبال'' متعلقات ''خطبات اقبال''، ''مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ'' کی صورت میں موجود ہے۔

مولانا صلاح الدین نے ''اقبال کے دس شعر'' تشریح کے لئے منتخب کئے تھے جو

پہلے ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں اقبال کے حوالے سے شائع ہونے والی سید عابد علی عابد کی تصانیف ''تلمیحات اقبال'' اور ''شعر اقبال'' کو جس کا ذیلی عنوان ''اقبال کے شعور تخلیق کا جائزہ'' درج کیا گیا تھا' کلام اقبال کے فنی پہلوؤں کا ماہرانہ جائزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے ''صد شعر اقبال'' (اردو) اور ''صد شعر اقبال'' (فارسی) میں منتخب کلام اقبال کی عالمانہ شرح پیش کی ہے۔ پروفیسر ا۔ د نسیم نے اردو فارسی شروح کے علاوہ ''اقبال اور مسلہء وحدت الوجود'' کے عنوان سے اس اہم مگر متنازعہ مسلہء پر عالمانہ کام کیا ہے۔

○

پاکستان میں اقبال شناسی کے فروغ میں مختلف درسگاہوں کے اساتذہ کا کردار نہایت اہم رہا ہے جنہوں نے کلام و افکار اقبال کے ساتھ اپنی دلچسپی اور وابستگی کو اپنے عزیز طلبہ کے دلوں میں بھی جاگزیں کیا اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنے۔ پروفیسر عابد علی عابد' صوفی تبسم' ڈاکٹر سید عبداللہ' پروفیسر وقار عظیم' ڈاکٹر عبادت بریلوی' ڈاکٹر افتخار صدیقی' پروفیسر عبدالشکور احسن' ڈاکٹر وحید قریشی' منور مرزا' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر سلیم اختر' ڈاکٹر تبسم کاشمیری' ڈاکٹر رفیع الدین ھاشمی' ڈاکٹر سعادت سعید' ڈاکٹر نعیم احمد' ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر آصف اعوان کے اسمائے گرامی اس ضمن میں چند مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

○

اقبال شناسی کی روایت میں جشن اقبال صدی کے حوالے سے منعقدہ تقریبات' جن میں عالمی اقبال کانگریس کا اہتمام خاص طور پر قابل ذکر ہے' اقبال کے فکر وفن کے مختلف پہلوؤں پر اشاعتی سلسلوں کا آغاز اور دیگر سرگرمیوں کو اقبالیات کے فروغ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے جس کا کچھ تذکرہ بھارت میں اقبال شناسی کے ضمن میں کیا جاچکا ہے۔

جشن اقبال صدی کے تاریخی موقع پر اقبال اکادمی پاکستان کے سربراہ ڈاکٹر محمد معز الدین تھے جنہوں نے ایک گفتگو میں اقبال صدی تقریبات کے حوالے سے مختلف منصوبوں کی وضاحت کی جس کے مطابق بین الاقوامی اقبال کانگریس کی تقریب ایک بڑا مرحلہ تھا جو پنجاب

یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں عالمی سطح کے معروف اسکالرز شریک ہوئے۔ دوسرا منصوبہ ''جاوید منزل'' کو ''اقبال میوزیم'' میں تبدیل کرنے کا تھا جو خوش اسلوبی سے تکمیل کو پہنچا اور اس میوزیم میں اقبال کی زندگی سے متعلق مختلف اشیاء اور دستاویزات کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ تیسرا اہم منصوبہ اقبال میموریل کی تعمیر کا تھا (یہ منصوبہ بھی بعد میں ''ایوان اقبال'' کی صورت مکمل ہوا(۵۶)۔

بین الاقوامی اقبال کانگریس میں ڈاکٹر این میری شمل' پروفیسر ایساندرو بوسانی' ڈاکٹر شیلا میکڈونف' باربرا مٹکاف' کارل ای۔ سوینگ' ڈبلیو ایس کرونا رتنے اور جوسی آرو کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے معروف سکالرز نے اقبال کے فکر و فن پر اپنے تحقیقی مقالات پیش کئے جنہیں بعد میں مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع کیا گیا۔

پروفیسر منور مرزا

اقبال صدی تقریبات کے دوران ہی پنجاب یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' قائم کرنے کا اعلان کیا گیا جس پر بعد میں پروفیسر منور مرزا کا بطور پروفیسر اقبالیات تقرر ہوا۔ اس سے قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہء اردو سے وابستہ تھے۔

پروفیسر منور ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو' فارسی اور عربی کے شاعر' معلم' مترجم اور بے پناہ مقرر تھے۔ تحریک پاکستان اور قائدین تحریک خصوصاً قائداعظم کی شخصیت اور ان کے تاریخی کارنامے ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے لیکن اقبالیات کے ساتھ ان کی والہانہ اور گہری وابستگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اقبال اور افکار اقبال کے فروغ کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے معلم' مقرر اور ناظمِ اقبال اکادمی پاکستان کی حیثیتوں میں ملک کے اندر اور بیرون ملک اقبال کانفرنسوں میں شرکت کر کے افکار اقبال کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ آغا شورش کاشمیری نے ان کو ''سفیر اقبال'' کا خطاب دیا تھا(۵۷)۔

اقبالیات کے موضوع پر ان کی تصانیف: میزان اقبال' ایقان اقبال' برہان اقبال'

علامہ اقبال کی فارسی غزل اور قرطاس اقبال میں شامل مقالات ان کی منفرد اقبال شناسی کا ثبوت ہیں۔

اقبال پر ان کی انگریزی تصانیف:۔

☆ Iqbal and Quranic Wisdom

☆ Iqbal Poet- Philosopher of Islam

میں شامل بعض مضامین ان کے اردو مضامین ہی کی انگریزی صورت ہیں جبکہ دیگر مضامین، حکمت اقبال کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تصانیف میں پروفیسر منور نے تصورات اقبال کا جس دقت نظری سے مطالعہ پیش کیا ہے اس کا اعتراف ان کے معاصرین نے بھی کیا ہے جن میں معروف قانون دان اور اسکالر، اے۔کے بروہی، خالد ایم اسحاق، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نمایاں ہیں۔

پروفیسر منور نے اقبال پر جو کچھ بھی لکھا، وہ ان کی عقیدت میں ڈوب کر لکھا اور اس اعتراف کے ساتھ لکھا کہ:۔

> ''علامہ اقبال کا کلام اور ان کا فکر محض براعظم کی وسیع و عریض حدود تک ہی محدود نہ رہا بلکہ وہ سیاسی، جغرافیائی اور نسلی حدود کو عبور کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ آج علامہ اقبال کی حیثیت ایک بین الاقوامی مفکر اور معلم کی ہے اور یہ امر مسلم ملت کے لئے اور پاکستان کے لئے لائق صد فخر ہے۔''(۵۸)

اقبال کے ساتھ پروفیسر منور کی عقیدت مندی عشق کی حدوں کو چھونے لگی اور پھر اقبال ان کے نزدیک مفکر اور معلم کی سطح سے بلند ہو کر ایک ایسے ''مردِ یقین'' کے منصب پر فائز ہو گئے جس کے:۔

> ''یقینِ محکم کی کیفیت کو دیکھ کر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قرآن

کے مطالب ان کے دل پر براہ راست وحی ہوتے
تھے‘‘(۵۹)۔

۱۹۸۰ء کے عشرے میں ان کے خطیبانہ جوہر اس وقت کھل کر سامنے آئے جب افغانستان روسی کشور کشائی کا براہ راست شکار ہوا۔ ان کا کلام اقبال کا گہرا مطالعہ کام آیا جس کو انہوں نے بخوبی عصری صورتحال پر منطبق کر کے سیاسی اور اقبالیاتی اجتماعات میں خوب خوب گرمی پیدا کی۔

ڈاکٹر سلیم اختر

پروفیسر منور کے رفقاء ان کی بزم آرائی اور شگفتہ مزاجی کے قائل تھے۔ وہ جہاں جاتے اپنی خوبیوں کی بدولت اپنے اردگرد مداحوں اور مریدوں کا ایک جھمگٹا اکھٹا کر لیتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے قیام کے دوران پروفیسر صابر لودھی، پروفیسر غلام الثقلین نقوی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر احسان الحق اور کئی دوسرے اصحاب ان کی محفل میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر بھی اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے۔ ''اقبالیات'' ان کے موضوعات تحقیق وتنقید کی فہرست میں شامل تھا لیکن ان کی طرز اقبال شناسی پروفیسر منور سے جدا ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک متضاد بھی رہی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر ۱۹۷۲ء سے اپنی ریٹائرمنٹ ۱۹۹۴ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی ۲۰۰۵ء تک شعبے سے وابستہ رہے۔ ان کا اہم تحقیقی وتنقیدی کام بھی اسی دوران منظر عام پر آیا جس میں اقبالیات پر ایک درجن سے زائد کتابیں شامل ہیں۔ صرف جشن اقبال صدی کے موقع پر ان کی جو تصانیف و تالیفات سامنے آئیں ان میں:۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، فکر اقبال کے منور گوشے، اقبال کا ادبی نصب العین اور اقبالیات کے نقوش شامل ہیں۔ اقبال اور افکار اقبال کے ساتھ ان کی دلچسپی اور وابستگی کا اظہار اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں اقبال پر لکھنے کے جس سلسلے کا آغاز انہوں نے کیا تھا، اُسے وہ اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اقبال شعاع صد رنگ (۱۹۷۸ء)' اقبال۔ممدوح عالم (۱۹۷۹ء)' اقبال اور ہمارے فکر رویّے (۱۹۸۲ء)' ایران میں اقبال شناسی کی روایت (۱۹۸۳ء)' اقبال شناسی کے زاویے (۱۹۸۵ء) اور''اقبال کی فکری میراث (۱۹۹۲ء) کو اس کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سال اقبال ۲۰۰۲ء کے موقع پر بھی ان کی دو ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ''اقبال۔شخصیت' افکار و تصورات: مطالعہ کا نیا تناظر'' ان کے مطالعہ اقبال کا حاصل ہے جس میں ان کے بیشتر مضامین و مقالات کو یکجا کر دیا گیا ہے (۶۰)۔

کتاب کے دیباچہ نگار' معروف اقبال شناس پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ:۔

> ''سلیم اختر کو اس بات کا احساس ہے کہ آج اقبال کے نقادوں کے سامنے سب سے بڑا کام اقبال کی از سرِ نو دریافت ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کی زندگی' شخصیت اور شاعری کے ہر گوشے پر کھل کر بحث کی جائے۔ اقبال کو پہلے سے پیر پیغمبر مان کے ان پر قلم اٹھانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نقادوں کی تحریریں مدلل مداحی سے آگے نہ جا سکیں گی''(۶۱)۔

اقبال پر لکھنے والے بعض معاصر ''ماہرین'' کے برعکس ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت پرستی اور فرضی عقیدت مندی طاری کرنے کے خلاف ہیں کہ اس کے نتیجے میں جو تحقیق بھی ہوگی وہ فرضی اور بے مقصدی ہوگی جو پہلے سے قائم چند مفروضوں اور فارمولوں کے گرد ہی گھومتی نظر آئے گی اور اقبال کا عالمی تناظر آنکھوں سے اوجھل رہے گا۔

> ''اقبال کو ایک مفکر' معلم اور فلسفی کے روپ میں پیش کرنے والے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ بھی جوان ہوگا اور قلب و نظر اور ذہن متنوع اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوں

گے۔ چنانچہ اگر غلطی سے کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آ
جائے تو ذہن کو گویا ۴۴۰ وولٹ کا جھٹکا لگتا ہے،،(۶۲)۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال پر لکھتے ہوئے شخصیت پرستی اور فرضی عقیدت مندی سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا بلکہ فکری آزادی اور ترقی پسندی کی راہ اختیار کرتے ہوئے افکار اقبال کی عصری معنویت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی اہم Contribution یہ بھی ہے کہ انہوں نے اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کی مختلف جہتوں اور اس کی وسعتوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے نہ صرف عالمی سطح پر اقبال کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا بلکہ بڑی کاوش سے اقبال شناس حلقوں کو اس سے متعارف بھی کروایا اور ثابت کیا کہ دنیا بھر کی تمام مہذب زبانوں میں اقبال کے فکر و فن کی تفہیم کا سلسلہ جاری ہے اور وہ اب محض ممدوح پاکستان ہی نہیں رہے بلکہ ممدوح عالم کے درجہ پر فائز ہو چکے ہیں۔

''علامہ اقبال کے فکر و فن کی تفہیم اور شاعری کے تراجم کے
سلسلہ میں برطانیہ' فرانس' اٹلی' جرمنی اور امریکہ کے ساتھ
ساتھ (سابق) سوویت یونین اور دیگر سوشلسٹ ممالک
میں بھی اشتراک عمل ملتا ہے اور اسلامی ممالک کے لئے تو
اقبال تھا ہی اپنا،،(۶۳)۔

اقبال کی حریت فکر کے تصور کو عام کرنے کے خواہاں علمائے اقبالیات میں شامل ڈاکٹر سلیم اختر جہاں عالمی سطح پر افکار اقبال کی بلندی کے اعتراف پر فخر کا اظہار کرتے ہیں وہیں وطن عزیز میں بسا اوقات فکر اقبال سے متصادم فکری رویوں کی پستی کو دیکھتے ہوئے اس پر احتجاج بھی کرتے ہیں:۔

– ''علامہ اقبال کے افکار و تصورات اور فکری میراث کی تشریح
و توضیح اور ان پر حاشیہ آرائی تو بہت ہوتی ہے مگر ان کے عملی

انطباق سے بالعموم اغماض برتا جاتا ہے‘ حالانکہ اب اصل
اہمیت اور ضرورت اس امر کے یقین کی ہے کہ ہم نے اقبال
کے حسین خواب کو کیسے نائٹ میئر میں تبدیل کر دیا‘‘(۶۴)۔

اقبال دشمنی یا اقبال ناشناسی

اقبال کے مجاوروں کا ایک گروہ بھی قرونِ وسطیٰ میں عیسائی پادریوں کی قائم کردہ احتساب عدالتوں (Inquisitions) کے طریق پر عمل کا خواہاں نظر آتا ہے اور علمی و تحقیقی مباحث میں بھی نقطہء نظر کے اختلاف کو ’’اقبال ناشناسی‘‘ بلکہ ’’اقبال دشمنی‘‘ کے مترادف ٹھہراتا ہے۔ پروفیسر ایوب صابر کی تو تحقیق ہی اقبال دشمنی کے مطالعے پر مبنی ہے جس میں بقول ان کے اقبال پر لکھی جانے والی معاندانہ کتب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے(۶۵)۔

مولانا نعیم صدیقی

ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالے ’’اقبال کا نفسیاتی مطالعہ‘‘ کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے جس پر کئی اطراف سے شدید ردِعمل ظاہر کیا گیا۔ مولانا نعیم صدیقی بھی ان اقبال شناسوں میں شامل ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنا ردِعمل ظاہر کیا بلکہ خود ڈاکٹر سلیم اختر ہی کا نفسیاتی تجزیہ کر ڈالا:۔

’’ہمارے زمانے کے ماہر نفسیاتی تجزیہ کار نے اقبال کی
شخصیت کو ٹیسٹ ٹیوب میں ڈال کر دیکھا ہے کہ اقبال فی
الحقیقت ہے کیا! بظاہر یہ نفسیاتی تجزیہ ہے مگر درحقیقت
نفسیاتی پوسٹ مارٹم۔ پوسٹ مارٹم کے ساتھ جرم کا تصور
شامل ہو جاتا ہے اور مضمون کا ماحصل بھی یہی ہے کہ اقبال
کے دماغ میں سے جرم کا وہ کیڑا پکڑا گیا ہے جس نے ان
سے اتنی زوردار شاعری کرائی اور انہیں حکیم الامت بنا کر
چھوڑا‘‘(۶۶)۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد اجمل بھی اسی شدید تنگ نظری کا شکار ہوئے کیونکہ وہ سلیم اختر سے بھی پہلے اقبال کو ایک ماہر نفسیات کی نظر سے دیکھ چکے تھے (۶۷)۔

تعصب اور تنگ نظری میں لتھڑی ہوئی یہ عقیدت مندی ہمیشہ حرکت میں رہی ہے جو کسی طرح سے بھی ''دشمنانِ اقبال'' حتیٰ کہ ان کی پشتوں تک کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ فاضل نفسیاتی تجزیہ کار سلیم اختر سے بھی پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنے والدین کا بھی نفسیاتی تجزیہ کرنا پسند کریں گے؟ اور پھر تمام بزرگانِ ملت' اولیاء' اتقاء کی صفیں آپ کے سامنے ہیں' کیا ان سب کا نفسیاتی تجزیہ شروع کر دینا چاہیئے؟ پھر انبیاء و رُسل کو بھی آپ کا ہے کو استثنیٰ میں رکھیں گے (۶۸)۔

پروفیسر ایوب صابر

پروفیسر ایوب صابر نے اقبال ناشناسوں یا اقبال دشمنوں کی جو طویل فہرست مرتب کی ہے اس میں ڈاکٹر سچد انند سنہا' ڈاکٹر تاراچند رستوگی' ڈاکٹر اکبر حیدری' اقبال سنگھ' جوش ملیح آبادی' عبدالحمید سالک' پروفیسر محمد عثمان' حامد جلالی' فراق گورکھپوری' علی عباس جلالپوری' سلیم احمد' مجنوں گورکھپوری' ایچ۔ ٹی سورلے' رالف رسل' صائب عاصمی' عتیق صدیقی' ریاض صدیقی' کلیم الدین احمد وغیرہ نمایاں ہیں جن میں بیشتر کی اقبال شناسی کا اجمالی جائزہ لیا جا چکا ہے البتہ علی عباس جلالپوری اور سلیم احمد کے اقبال کے بارے میں خیالات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علی عباس جلالپوری

علی عباس جلالپوری ایک ایسے مارکسی دانشور ہیں جنہوں نے عمر بھر خرد افروزی اور روشن خیالی کے تصورات عام کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ وہ ان گنے چنے افراد میں شامل ہیں جنہوں نے اردو میں فلسفیانہ تصورات اور مسائل پر فکر انگیز کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ''روحِ عصر''، ''روایات فلسفہ''، ''عام فکری مغالطے'' اور ''کائنات اور انسان'' بھی شامل ہیں۔ افکار اقبال کے حوالے سے لکھی جانے والی ان کی تصنیف ''اقبال کا علم کلام'' ہے جو روایتی اقبالیاتی موضوعات سے ہٹ کر لکھی گئی ہے اور جس کی اشاعت سے کئی علمی و فکری بحثوں کا آغاز ہوا۔

کتاب کا آغاز ہی جلالپوری کے اس موٴقف سے ہوتا ہے کہ:۔

> ''اقبال ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری دنیائے ادب کا
> گراں بہا سرمایہ ہے۔ جہاں تک ان کے فکر و نظر کا تعلق ہے
> وہ ایک متکلم ہیں کیونکہ انہوں نے بھی مشاہیر متکلمین اشعری'
> رازی' غزالی وغیرہ کی طرح مذہب کی تطبیق معاصر علمی
> انکشافات سے کرنے کی کوشش کی ہے''(۶۹)۔

جلالپوری فلسفہ و کلام کے حدود کے بارے میں ایک واضح اور دوٹوک مؤقف کے حامل ہیں یعنی ان کے نزدیک فلسفہ ایک مستقل' آزاد اور مسلسل ذہنی کاوش کا نام ہے جسے کسی مخصوص عقیدے کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔

> ''جب عقلی استدلال اور فلسفیانہ تدبر کو چند مخصوص مذہبی
> عقائد کی تصدیق و توثیق کے لئے وقف کر دیا جائے تو وہ
> فلسفہ نہیں رہتا بلکہ علم کلام کہلاتا ہے''(۷۰)۔

ہمارے بیشتر اقبال شناس ایک طرف تو ''شاعر اسلام'' اور ''مفکر اسلام'' کے القابات کو جس بیدردی سے استعمال کرتے ہیں اور جن کو سامنے رکھتے ہوئے جلالپوری کے لئے فلسفی اور متکلم کی تعریفوں کی روشنی میں اقبال کی ایک فلسفی کی حیثیت کو مسترد کر کے اسے متکلم ثابت کرنا آسان ہو جاتا ہے گو کہ فلسفے کے لئے انہوں نے جس ''مستقل آزاد ذہنی کاوش'' کی شرط عائد کی ہے اس کا اطلاق تاریخ فلسفہ کے بعض نامور اور بڑے فلسفیوں پر بھی کُلی طور پر کرنا' جلالپوری کی ایک محبوب اور مرغوب اصطلاح میں محض ''مغالطہ'' معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے اقبال شناس جلالپوری کو محض اس لئے بھی معطون کرتے ہیں کہ وہ اقبال کو فلسفی نہیں مانتے اور اسی اختلاف کی بنیاد پر جلالپوری کی پوری علمی کاوش کو مسترد کر دیتے ہیں اور ان کی عالمانہ تصنیف ''اقبال کا علم کلام'' کا شمار بھی اقبال پر لکھی جانے والی معاندانہ تحریروں میں کرتے ہیں جو کسی طرح سے بھی مناسب نہیں۔

فلسفی اور متکلم کی بحث کے علاوہ جلالپوری کے جس بیان پر سب سے زیادہ غضب ناکی کا اظہار کیا گیا' وہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ اقبال کے بعض بنیادی تصورات جیسے خودی اور زماں

وغیرہ بہ تمام وکمال فشٹے اور برگساں سے ماخوذ ہیں (۷۱)۔ حالانکہ جلالپوری سے پہلے اسی طرح کے خیالات کا اظہار ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' بشیر احمد ڈار اور کئی دوسرے اصحاب بھی کر چکے تھے اور جلالپوری نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن اس کے باوجود قابل گرفت بھی جلالپوری ہی ٹھہرتے ہیں۔

سلیم احمد

سلیم احمد نظریاتی طور پر علی عباس جلالپوری کے عین مخالف ہیں لیکن ''اقبال ایک شاعر'' لکھنے کے بعد وہ بھی جلالپوری کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں یعنی مخالفین اقبال کی صف میں۔ ان کے مطالعات وتفہیمات اقبال' جلالپوری سے مختلف انداز لئے ہوئے ہیں اور اقبال پر ان کے اعتراضات کی نوعیت بھی جلالپوری سے مختلف ہے۔

سلیم احمد عظمت اقبال کا اعتراف بھی کرتے ہیں (شاید دل میں چور رکھ کر) جب وہ یہ کہتے ہیں:۔

> ''اقبال ہمارے ماضی قریب کی عظیم ترین علمی' فکری اور سیاسی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مشرق ومغرب کے فلسفوں سے بھی آگاہ اور عہد حاضر کے علوم ومسائل سے باخبر ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی نظیر جدید مشرق میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ پھر وہ ایک ایسے تہذیبی اور سیاسی نظریئے کے بانی ہیں جس نے ایک ملک کو جنم دیا ہے اور ان کی یہ حیثیت ایسی ہے جو تاریخ عالم میں کسی شاعر یا مفکر کو حاصل نہیں ہوئی''(۷۲)۔

لیکن تاریخ عالم کے اسی بے مثال شاعر اور مفکر کے بارے میں جب وہ انکشاف کرتے ہیں کہ اس کا (اقبال کا) مرکزی مسئلہ نہ خودی ہے' نہ عشق' نہ عمل' نہ قوت وحرکت بلکہ ان سب کے برعکس موت ہے (۷۳)۔ تو بادی النظر میں وہ اپنے پہلے دعویٰ کی خود ہی نفی بھی کر دیتے ہیں جس پر سخت ردعمل بھی ظاہر کیا گیا۔ خود کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر کرار حسین نے سلیم احمد

کے استدلال کو کلی طور پر تسلیم نہیں کیا (۷۴)۔

آ گے چل کر سلیم احمد' موت کو اقبال کے وجود کا سب سے زیادہ گہرا' سب سے زیادہ بنیادی اور سب سے زیادہ فعال مسئلہ قرار دیئے جانے کے سبب کی وضاحت کرتے ہیں کہ انفرادی موت' اجتماعی جمود' انحطاط' بے عملی موت ہی کی شکلیں ہیں جن سے جنگ کے لیے اقبال نے خودی' عشق اور عمل کی فوجیں میدان میں اتاری ہیں (۷۵)۔ گویا تصور موت یا خواہش مرگ کے ڈانڈے بالآخر حیات ابدی یا تصور بقائے دوام سے مل جاتے ہیں جس کی طرف ناقدین نے توجہ دیئے بغیر محض اختلاف کا حق استعمال کیا ہے' جسے سلیم احمد بھی کھلے دل کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی بات کو حرف آخر کا درجہ دینے پر مُصر بھی نہیں ہیں (۷۶)۔

محمد سہیل عمر کا واضح موقف

اقبال کے ''دفاع'' میں لکھی گئی پروفیسر ایوب صابر کی تحقیقی تصنیف ''اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ'' کے مقدمے میں سہیل عمر نے جس صائب رائے کا اظہار کیا ہے' اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر اعتراضات کی فہرست مرتب کرتے ہوئے' اسے مدنظر رکھا جانا چاہئے اور ہر اختلافی نکتے کو معاندانہ اعتراض فرض کر لینے سے گریز کرنا چاہئے۔

> ''خلیفہ عبدالحکیم کی یہ شکایت کہ اقبال' مغرب دشمنی میں حد سے گزر جاتے ہیں اور سلیم احمد کی یہ دریافت کہ ان کی شاعری کا مرکزی مسئلہ 'موت' ہے' اقبال دشمنی کا مظہر نہیں ہے۔ ان پر گفتگو کی سطح اور اسلوب بالکل مختلف ہونا چاہئے'' (۷۷)۔

○

اقبال کی حیات' شخصیت اور فکر و فن کے حوالے سے لکھے گئے مشاہیر کے مضامین و مقالات کو مختلف اردو' انگریزی مجموعوں کی صورت میں مرتب کیا گیا جن میں سے ''فلسفۂ اقبال''

مرتبہ بزم اقبال (۷۸)۔ ''اقبال۔ پیامبر اقبال'' مرتبہ آغا شورش کاشمیری (۷۹)۔ اور اقبال بحیثیت مفکر (انگریزی) (۸۰)۔ چند مثالیں ہیں۔

اسی طرح ممتاز حسین، صوفی تبسم اور یوسف سلیم چشتی کی مختلف رسائل و جرائد میں بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا (۸۱)۔

اقبالیات میں اہم اضافے

افکار اقبال کے مختلف پہلوؤں پر لکھی جانے والی جن اہم تصانیف کا تذکرہ ناگزیر ہے ان میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی ''اقبال اور قرآن'' اپنے موضوع پر ایک جامع اور قابل قدر تصنیف کا درجہ رکھتی ہے جس میں افکار اقبال کا بنیادی ماخذ قرآن کو قرار دیا گیا ہے جبکہ پروفیسر طاہر فاروقی نے ''اقبال اور محبت رسولؐ'' میں جذبہء عشق رسول کو اقبال کی فکر کا ایک اہم وصف ثابت کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں جشن اقبال صدی کے موقع پر شائع ہوئیں۔

افکار اقبال میں تصور خودی کی مرکزی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے جن دوسرے کلیدی تصورات کو کم وبیش ہر اقبال شناس نے اپنے مباحث میں جگہ دی ہے وہ عقل اور عشق کے تصورات ہیں۔ اس حوالے سے اقبال کے جشن صدی کے موقع پر شائع ہونے والی ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیف ''تصورات عشق وخرد۔ اقبال کی نظر میں'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں مغربی اور اسلامی پس منظر میں اقبال کے عشق وخرد کے تصورات کا بھرپور مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر ایم۔ ایم شریف کے بعد ڈاکٹر نصیر احمد ناصؔر نے اردو میں فلسفہء جمالیات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ''اقبال اور جمالیات'' کو اپنے موضوع پر ایک اہم اور بنیادی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

اقبال کی سیاسی فکر کے حوالے سے عام طور پر محمد احمد خاں کی ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، رئیس احمد جعفری کی ''اقبال اور سیاست ملی'' اور ڈاکٹر پروین شوکت کے انگریزی تحقیقی مقالے "Political Philosophy of Iqbal" (اردو ترجمہ: اقبال کا فلسفہء سیاست از

مولانا ریاض الحق عباسی) زیادہ معروف ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحمید کی ''اقبال بحیثیت مفکر پاکستان''، احمد سعید کی ''اقبال اور قائداعظم'' اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی ''اقبال کے آخری دو سال'' میں بھی اقبال کی سیاسی فکر کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مسئلہ اجتہاد پر اقبال نے تمام عمر تفکر کیا اور "Reconstruction" میں ایک پورا لیکچر اسی موضوع پر موجود ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے ''اقبال کا تصور اجتہاد'' اور ڈاکٹر یوسف گورائیہ نے ''اقبال اور اجتہاد'' لکھ کر فکر اقبال کے حوالے سے اسی مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

○

ڈاکٹر سعید اختر درانی بنیادی طور پر ایک طبعیات دان ہیں لیکن اقبال کے قیام یورپ سے متعلق بعض دستاویزات کی جستجو ان کو اقبالیاتی تحقیق کی جانب راغب کرنے کا سبب بن گئی۔ ''اقبال یورپ میں'' اور ''نوادر اقبال یورپ میں'' ان کی وہ تحقیقی تصانیف ہیں جن میں کیمبرج، لندن اور میونخ یونیورسٹی میں اقبال کی تعلیمی زندگی سے متعلق بعض اہم دستاویزات اور مکاتیب شامل ہیں جن سے حیات اقبال کے ایک اہم دور سے متعلق بعض نئی معلومات کا انکشاف ہوتا ہے۔

تدوین وتشریحاتِ کلامِ اقبال

اقبال کے اردو فارسی کلام کی تشریحات کے سلسلے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر ا۔ د نسیم، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔

پاکستان میں اقبال کے حوالے سے تصحیح متن کی طرف رجحان کم رہا ہے لیکن اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ''تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' کی صورت میں اور پروفیسر سعید شیخ نے خطبات اقبال (Reconstruction of Religious Thought in Islam) کا محشّیٰ ایڈیشن مرتب کر کے ایک تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے خود کو اقبال اور اقبالیاتی تحقیق کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ وہ اقبال کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات کی رفتار اور معیار پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین اور مقالات کے علاوہ ان کے تبصرے، تجزیئے اور جائزے باقاعدگی سے اقبالیات کے طالب علموں اور محققوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں ڈاکٹر اقبال پر ڈاکٹریٹ کرنے والے پہلے محقق بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صدیق جاوید (فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ)، ڈاکٹر صابر حسین کلوروی (باقیات شعر اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، ڈاکٹر محمد آفتاب احمد (اردو شاعری پر اقبال کے اثرات) پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

○

اقبال صدی کے موقع پر اقبالیاتی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ عالمی اقبال کانگریس میں پڑھے گئے اردو/ انگریزی مقالات کو کئی جلدوں میں مرتب کیا گیا۔ مستقل تصانیف کے علاوہ علمی، ادبی رسائل و جرائد نے خصوصی طور پر اقبال نمبر شائع کئے۔ مختلف جرائد کی مختلف اشاعتوں میں اقبالیات پر جو مضامین اور مقالات شائع ہوئے ان کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو یقینی طور پر اقبالیات کے طالب علموں اور محققوں کے لئے مفید ثابت ہوا۔

بزم اقبال کے تحت جو مجموعے شائع ہوئے ان میں :۔ اقبال شناسی اور ادبی دنیا، اقبال شناسی اور اوراق (مرتبہ ڈاکٹر انور سدید)، اقبال شناسی اور فنون (مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر)، اقبال شناسی اور راوی (مرتبہ رانا جماعت علی خاں)، اقبال شناسی اور سویرا (مرتبہ ڈاکٹر اجمل نیازی)، اقبال شناسی اور فلسفہ کانگریس جرنل (مرتبہ ڈاکٹر عبدالخالق)، اقبال شناسی اور سیارہ (مرتبہ جعفر بلوچ)، اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ (مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)، اقبال شناسی اور نیرنگ خیال اور اقبالیات نقوش (مرتبہ تسلیم احمد تصور) اہم ہیں [۸۲]۔

جشن اقبال صدی ۱۹۷۷ء کے بعد پاکستان میں اقبال شناسی کی روایت میں ایک بار پھر تموج کی کیفیت اس وقت دیکھنے میں آئی جب سرکاری سطح پر سال ۲۰۰۲ء کو ''سالِ اقبال'' کے

طور پر منانے کا اعلان کیا گیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری علمی و ادبی ادارے حرکت میں آئے اور پورے سال کے دوران اقبالیاتی فکر و ادب کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھنے، پڑھنے، کہنے سننے اور شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا۔ سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد اور ماہنامہ ''ماہ نو'' لاہور نے خصوصی اقبال نمبر شائع کئے۔

سال اقبال کے دوران خصوصی تصانیف و تالیفات سامنے آئیں جن میں سے ایک محمد اکرام چغتائی کی مرتبہ انگریزی تالیف "Iqbal- New Dimensions" بھی ہے جس میں معروف عالمی سکالرز کے مقالات کو جمع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سہیل عمر اور ڈاکٹر وحید عشرت نے ''اقبالیات کے سو سال'' کی صورت میں ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا۔ ایک مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی مرتب کیا۔ اقبالیات سے وابستگی رکھنے والوں کے لئے سال اقبال ۲۰۰ کا ایک تحفہ، فرزند اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال کی بے باک خودنوشت ''اپنا گریباں چاک'' بھی ہے جو اپنی منفرد خصوصیات اور جرأت مندانہ اسلوب کی بدولت علمی و ادبی حلقوں میں زیر بحث رہی ہے (۸۳)۔

ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنے مطالعات و تحقیقات اقبال کو ''اقبال۔ نئی تفہیم'' کے عنوان سے پیش کیا۔ ڈاکٹر منظور احمد کی ''اقبال شناسی'' اور ڈاکٹر فتح محمد ملک کی ''اقبال فراموشی'' بھی سال اقبال کی مناسبت سے اہم ہیں۔

درسگاہ اقبال، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں بھی سال اقبال منانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ مجلّہ ''راوی'' میں اقبال پر خصوصی مقالات شامل کئے گئے جبکہ سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے مجلّہ ''تخلیق مکرر'' میں ''اقبال۔ مشرق و مغرب کی نظر میں'' کے عنوان کے تحت اقبال پر بہترین عالمی تحریروں سے براہ راست تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کیا گیا۔

۲۰۰۵ء کے آغاز پر ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کی تصنیف ''اقبال اور عصری مسائل'' منظر عام پر آئی جس میں تاریخ کو تناظر بناتے ہوئے افکار اقبال کی عصری معنویت پر مدلل اور مفصل بحث کی گئی ہے جس کی بدولت اس تصنیف کو اقبالیاتی تحقیق میں ایک اہم اضافے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی: ایک خصوصی مطالعہ

اقبال شناسی کی روایت کا ایک اہم نام ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا بھی ہے جو ایک ممتاز اسلامی مفکر، ماہر تعلیم اور اقبال شناس کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام پر فائز ہیں۔ انہوں نے اپنی علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں اقبال اور فلسفہء اقبال کو اولیت دی اور اپنے علمی مقالات میں اس کے متنوع پہلوؤں کو موضوع تحقیق بنایا، بالخصوص اپنی تصنیف ''حکمت اقبال'' میں اقبال کے فلسفہء خودی کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جن اسکالرز نے خصوصی طور پر افکارِ اقبال کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا، ڈاکٹر مرحوم کا نام اِن میں نمایاں ہے وہ خلیفہ عبدالحکیم کے ہم عصر تھے اور اُن کے ساتھ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں بھی ایک عرصہ تک اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ اِن کا تذکرہ بھی خلیفہ صاحب کے ساتھ ہی آنا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر رفیع الدین کی اقبال شناسی راقم کی تحقیق کا خاص موضوع رہا ہے اسی لئے اس روایت کے آخر میں ڈاکٹر رفیع الدین اور ان کے فکری جانشین، مظفر حسین کی اقبالیاتی کاوشوں کا قدرے تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اسلامی فکر کے حوالے سے ان کی تصانیف:۔

"Ideology of the Future"، ''قرآن اور علم جدید'' اور "Manifesto of Islam" کو علمی حلقوں میں بے حد سراہا گیا جبکہ ''اسلامی نظریہء تعلیم'' اور "First Principles of Education" کو فلسفہء تعلیم پر اعلیٰ پائے کا کام تسلیم کیا گیا ہے۔

ان کی آخری تصنیف ''حکمت اقبال'' کو اقبالیاتی ادب میں ایک ایسی تصنیف کا درجہ حاصل ہے جس میں فلسفہء خودی کو ایک منفرد اور مربوط طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ممتاز اقبال شناس اور دانشور عبدالحمید کمالی ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں اسلامی فکر کی نشاۃ نو کے چار ادوار کا ذکر کرتے ہیں۔ چوتھے دور میں وہ میاں محمد شریف، غلام احمد پرویز، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ابوالاعلیٰ مودودی، ولی الدین اور ہادی حسین وغیرہ کی خدمات کا

ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ان حضرات کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب مسلم مفکرین کے پاس نہ صرف کہنے کے لئے کچھ ہے بلکہ خود مغربی افکار وروایات میں توسیع کرنے کے لئے بھی ان کے پاس بہت سا قیمتی سرمایہ ہے (۸۴)۔

ڈاکٹر رفیع الدین اپنی عملی زندگی کے بیشتر حصہ میں محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ کشمیر کے ایک تعلیمی ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی تصنیف "First Principles of Education" پر ان کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے D.Litt کی ڈگری بھی عطا ہوئی۔ اقبال اکیڈمی پاکستان کے بانی ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۶۶ء میں انہوں نے ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کی بنیاد رکھی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنے تعلیمی نظریات کی عملی صورت گری کے لئے "The Holy Quran University of Sciences" کے منصوبے پر کام کررہے تھے جسے تکمیل تک پہنچانے کی انہیں مہلت نہ مل سکی لیکن ایک تعلیمی مفکر کی حیثیت سے انہوں نے جو فکری وعملی خدمات سرانجام دیں' ان کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ سید الطاف حسین بریلوی نے ڈاکٹر صاحب کی اس حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''پورے برصغیر پاک وہند کے مشہور ماہرین تعلیم پر نظر ڈال جائیے' ان میں سے آپ کسی کی بھی کوئی کتاب اس پایہ کی نہ پائیں گے جو غیر ملکی کتابوں کے مقابلے میں رکھی جاسکے لیکن صرف ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تصنیف "First Principles of Education" کو اس لحاظ سے ایک استثنائی حیثیت حاصل ہے کہ یہ فلسفۂ تعلیم پر کسی پاکستانی کی لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے جو نہ صرف بین الاقوامی اور ہمہ گیر اہمیت ودلچسپی کی حامل ہے بلکہ اس میں سرپرسی نن' جان

ڈیوی' میک ڈوگل' فرائڈ' ایڈلر اور کارل مارکس کے نظریات
پر تنقید کی گئی ہے اور اس سے پیدا شدہ نقصان دہ اثرات کی
مؤثر نشاندہی کی گئی ہے''۔(۸۵)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اپنی آخری تصنیف ''حکمت اقبال'' سے پہلے بھی اپنے مختلف مقالات میں فلسفہء اقبال کے متنوع پہلوؤں کو زیر بحث لا چکے تھے لیکن جس مربوط اور منفرد انداز میں انہوں نے فلسفہء خودی کی تشریح و توضیح کی سعی کی ہے اس کی مثال اقبال شناسی کی روایت میں ہمیں کم نظر آتی ہے۔

معروف نقاد اور اقبال شناس ڈاکٹر سلیم اختر نے' جن کی اقبال شناسی کا مختصر جائزہ ہم گزشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں'' حکمت اقبال'' کی اشاعت کے بعد منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ''حکمت اقبال'' کو ایک جداگانہ علمی بلکہ فلسفیانہ حیثیت کی حامل تصنیف قرار دیا جس کی اہم ترین خصوصیات' نکتہ طرازی اور خیالات کی گہرائی کی بدولت اسے اقبال پر لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں یعنی ''روح اقبال'' (ڈاکٹر یوسف حسین خان)' ''فکر اقبال'' (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)' ''اقبال اور جمالیات'' (ڈاکٹر نصیر احمد ناصر) اور ''اقبال نئی تشکیل'' (عزیز احمد) میں شمار کیا جا سکتا ہے(۸۶)۔

ڈاکٹر سلیم اختر یقیناً اقبال شناسی کی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن ''حکمت اقبال'' کو اقبالیات پر لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں سے ایک قرار دیتے ہوئے انہوں نے اس کی کوئی علمی یا تنقیدی بنیاد فراہم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف یہ سمجھ لینا کہ اقبال پر چھپنے والی اکثر و بیشتر کتابیں کالج نوٹس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں اور ''حکمت اقبال'' اپنے موضوعات و مندرجات کے لحاظ سے مختلف نظر آتی ہے لہٰذا وہ اقبالیات کی چند بہترین کتابوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے تو یہ سرسری مطالعہ کتاب کی اصل خوبیوں کو سامنے لانے سے قاصر ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے کتاب کی سب سے اہم خصوصیت کا انکشاف کرتے ہوئے بھی پہلے خود مصنف کے دعویٰ کو بنیاد بنایا ہے جو حقیقت میں کتاب کا سرنامہ ہے جس کے مطابق:۔

''کلام اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی مفصل اور منظم تشریح''[۸۷]۔

اور پھر اس کا ابطال کرتے ہوئے مصنف کے دعاوی کو اظہار عقیدت میں غلو کا نتیجہ قرار دیا ہے جس کی بناء پر کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی سب سے بڑی خامی بھی ثابت ہوتی ہے[۸۸]۔ قاری اس منطق کو سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے کہ اقبالیات کی چند بہترین کتابوں میں شمار کئے جانے کے قابل کتاب (حکمت اقبال) یکا یک تبصرہ نگار کی نظر میں ایک ایسی کتاب کیونکر بن جاتی ہے جس کا بیشتر حصہ ''نفیت'' پر استوار ہے یعنی اثبات خودی کے لئے سب کی نفی ضروری ہے[۸۹]۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے مصنف کے جن خیالات پر گرفت کرتے ہوئے اسے کتاب کی خامیاں قرار دیا ہے، بعض مبصرین کے نزدیک وہی کتاب کی اصل خوبیاں ہیں[۹۰]۔

مرزا محمد منور نے ''حکمت اقبال'' پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

''حکمت اقبال'' کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ کے فلسفے پر جس کا نچوڑ ''خودی'' ہے یہ پہلی مربوط اور بھرپور کتاب ہے ورنہ 'خودی' پر مضامین و مقالات تو لکھے جاتے رہے ہیں، اسے پوری کتاب کا موضوع نہیں بنایا گیا تھا[۹۱]۔

یقیناً ''حکمت اقبال'' کی ایک اہم اور بنیادی خصوصیت جو اسے اقبالیات پر لکھی جانے والی دیگر کتب سے ممتاز کرتی ہے، یہی ہے کہ اقبال کی فکر کو ایک ایسا نظام حکمت Philosophical System تسلیم کیا جائے، خودی جس کا مرکزی اور اساسی تصور یا سرچشمہ ہے جس سے ان کے دیگر تمام تصورات صادر ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے اندر ایک علمی اور عقلی ربط موجود ہے جو ڈاکٹر رفیع الدین کے قول کے مطابق:۔

''طویل مطالعہ اقبال کا حاصل ہے''[۹۲]۔

افکار اقبال کے ساتھ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی طویل وابستگی کے دعویٰ کو محض رسمی جملہ

قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ''حکمت اقبال'' کی اشاعت (۱۹۶۹ء) سے طویل عرصہ قبل وہ اقبال کا تصور خودی (۱۹۵۳ء)، اقبال کا فلسفہ (۱۹۶۰ء)، اقبال کا تصور ارتقاء (۱۹۶۰ء) اور دیگر عنوانات کے تحت افکار اقبال کو موضوع بنا چکے تھے (۹۳)۔

''حکمت اقبال'' کی اشاعت سے پیشتر، چند کتابوں کو چھوڑ کر، جنہیں قبل ازیں بہترین کتابیں قرار دیا گیا ہے، بیشتر تصانیف کی عام کیفیت یہ ہے کہ چند مرغوب یا نصابی موضوعات کی بے جا اور بے مزا تکرار ایک عمومی رجحان کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اقبالیات کے زیادہ تر مصنفین کا انداز تحریر یہ ہے کہ فکر اقبال کے کسی ایک موضوع پر لکھتے ہوئے اس کے اساسی اور دیگر تصورات سے اعتناء کی کوئی صورت روا نہیں رکھی جاتی اور اقبال کی مجموعی فکر کی روشنی میں اس کے تصورات کی تفہیم سے گریز کرتے ہوئے یا پھر پہلے سے طے شدہ نظریات اور نتائج کی تصدیق اور تطبیق کیلئے پورا زور قلم صرف کر دیا جاتا ہے۔ اقبال کی اردو، انگریزی نثر اور دوسرے بنیادی ماخذ سے پہلو تہی کرتے ہوئے زیادہ تر مثالیں زبان زد عام اردو اشعار سے دلیل کے طور پر پیش کر کے اپنا علمی و تحقیقی فریضہ سرانجام دے دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی اقبال شناسی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اقبال کے بارے میں شاعر فلسفی یا فلسفی شاعر یا پھر فلسفی یا متکلم کی بحث میں الجھے بغیر اس کے تصورات کو عقلی اور منطقی ترتیب و تنظیم کی بنیاد پر ایک نظام حکمت قرار دیا ہے جس کا مطالعہ ایک کل یا وحدت کی حیثیت میں کیا جانا چاہیئے اس لئے کہ ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک:۔

> ''اقبال کے تصورات کے بارے میں جس قدر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جس قدر مباحثے یا اختلافات موجود ہیں، جس قدر نادانستہ طور پر اپنے اپنے خیالات کی تائید میں استعمال کرنے کی غلط کوششیں کی جا رہی ہیں اور ان کے مفہوم کے اندر تضادات کے شبہات پیدا کئے جا رہے ہیں ان سب کا باعث یہی ہے کہ انہوں نے اس اصول کو مدنظر نہیں رکھا''(۹۴)۔

ان کا موقف ہے کہ:۔

''اقبال میں اور دوسرے فلسفیوں میں فرق یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے' کائنات کی وحدت کا اصول یا حقیقت کائنات جو کائنات کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کرتی ہے حق تعالیٰ کا وجود ہے۔ ان صفات کے ساتھ جو خاتم الانبیاء کی تعلیم میں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں''(۹۵)۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی زندگی اور ان کے خیالات کے غائر مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام اور اقبال ان کی تحقیقی زندگی کے محبوب موضوعات ہیں۔ اقبال اور اسلام ان کے نزدیک کوئی جداگانہ موضوعات نہیں ہیں کیونکہ اقبال کا فلسفہء خودی ان کی نظر میں اسلام کی حکیمانہ توجیہہ کا درجہ رکھتا ہے اور خود انہوں نے زندگی میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اقبال کے فلسفہء خودی ہی کی تشریح وتفسیر ہے۔

مظفر حسین کی اقبالیاتی کاوشیں

اقبال شناسی کی روایت کا مطالعہ' خاص طور پر مظفر حسین کی اقبالیاتی کاوشوں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہ ان کے نزدیک علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین بیسویں صدی کے وہ مفکر اور مفسر ہیں جنہوں نے ''فلسفہء خودی'' اور ''نظریہ داعیہ الی العین'' کے ذریعے سے حکمت قرآنی اور جدید اسلوب میں عصر حاضر کے سامنے پیش کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین اپنی تمام علمی وتحقیقی کاوشوں کو اقبال کے فیضان کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اسے فلسفہء خودی کی تفسیر قرار دیتے ہیں (۹۶)۔ جبکہ مظفر حسین کا فخر اور تخصص یہ رہا کہ انہوں نے اقبال شناسی کی اس روایت کو نبھانے کی کوشش کی جو ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے قائم کی تھی (۹۷)۔

مظفر حسین' ڈاکٹر رفیع الدین کی وفات سے کوئی تین چار سال قبل ان سے متعارف

ہوئے اوران کے تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے بھی مظفر حسین کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا گویا ان کو جس جوہر قابل کی تلاش تھی وہ ان کو مظفر حسین کی صورت میں حاصل ہو گیا لہٰذا جب ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر رفیع نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کی بنیاد رکھی تو مظفر حسین اس کے سات اساسی اراکین میں شامل تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کی وفات ۱۹۶۹ء کے بعد یہ مظفر حسین ہی تھے جنہوں نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ مل کر اسلامک ایجوکیشن کانگریس کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کے علمی جریدے ''اسلامک ایجوکیشن'' (بعد میں ''اسلامی تعلیم'') کے ذریعے سے ڈاکٹر مرحوم کے علمی و تعلیمی افکار کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور حقیقی معنوں میں خود کو ڈاکٹر رفیع الدین کا فکری جانشین ثابت کر دکھایا(۹۸)۔

مظفر حسین (ولادت گوجرہ، ضلع لائل پور۔ اب فیصل آباد، ۱۹ ستمبر ۱۹۲۹ء) نے سائنس اور زراعت میں بی۔ ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں اور اس کے علاوہ صحافت میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ آپ نے اردو ادب میں ایم۔ اے بھی کیا اور محکمہ زراعت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ڈائریکٹر، ایگریکلچرل انفارمیشن پنجاب کے طور پر بھی دس سال تک اپنے فرائض انجام دیئے۔ آپ نے بطور ممبر کسان کمیشن بھی کام کیا۔

مظفر حسین نے معروف علمی جرائد کے لئے، اسلام، اقبالیات، پاکستانیات، تعلیم اور دینی سائنس کے موضوعات پر بیسیوں تحقیقی مقالات قلمبند کئے۔ آپ کی اہم تصانیف میں:۔

اقبال کے زرعی افکار، فکر اقبال کے دو بنیادی تصورات (خودی اور آخرت)، سائنس کی دینیات (تالیف) پاکستان کی منزل مراد۔ روحانی جمہوریت، پاکستان۔ تجربہ گاہ اسلام اور ''اساس فکر اقبال'' شامل ہیں۔

آپ کی وفات (۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء) کے بعد روزنامہ ''پاکستان'' لاہور میں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۳ء تک شائع ہونے والے ان کالموں کا انتخاب ''خیال در خیال'' کے عنوان سے شائع ہوا(۹۹)۔

اس انتخاب میں ادب وصحافت سے تعلق رکھنے والی بعض اہم شخصیات کے تعزیتی شذرات بھی شامل کیے گئے ہیں جن میں مظفر حسین مرحوم کی شخصیت اوران کی علمی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

روزنامہ ''پاکستان'' کے اداریے میں بجاطور پر اعتراف کیا گیا کہ:۔

''وہ اقبال شناسی کے ''ڈاکٹر رفیع الدین مکتب فکر'' کے امام تھے۔انہیں ڈاکٹر رفیع الدین سے کم وبیش وہی نسبت تھی جو مولانا حمید الدین فراہی سے مولانا امین احسن اصلاحی کو۔ اس کے باوجود وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے......وہ ایک حقیقی مفکر تھے''(۱۰۰)۔

مظفر حسین مرحوم نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ساتھ اپنی وابستگی اوران کی اعلیٰ علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۳ء میں ''ڈاکٹر محمد رفیع الدین میموریل لیکچر'' کا اجراء کیا اور اس سلسلے کا پہلا لیکچر دینے کی ذمہ داری بھی خود ہی قبول کی اور 'پاکستان' نفاذ اسلام اور اقبال' کے عنوان سے افتتاحی لیکچر دیا۔

مظفر حسین مرحوم کی دعوت پر ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری' علامہ شبیر بخاری' جناب جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر محمود احمد غازی' محمد رفیع الدین میموریل لیکچر دے چکے ہیں جنہیں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس نے شائع کیا ہے۔

مظفر حسین نے ڈاکٹر رفیع الدین کے خصوصی موضوع اسلام اور سائنس کو آگے بڑھاتے ہوئے بعض اعلیٰ پائے کے مقالات بھی قلمبند کیے جو ان کے مضامین کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں(۱۰۱)۔

مظفر حسین نے افکار اقبال کے بعض ایسے اساسی پہلوؤں کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا جنہیں عام طور پر ہمارے اکثر اقبال شناسوں نے لائق توجہ خیال نہیں کیا جیسے 'علامہ اقبال کا تصور بقائے دوام'' جسے ''متعلقات خطبات اقبال''(۱۰۲)۔ میں شامل کرتے ہوئے مرتب'

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اعتراف کیا: ''پانچواں علمی اور پُر مغز مقالہ'' اقبال کا تصور بقائے دوام ہے' یہ خاص مضمون ہے اور بڑی محنت سے لکھا گیا ہے''(۱۰۳)۔

فکرِ اقبال کے حوالے سے یہ ایک اہم موضوع ثابت ہوا اور بعد میں اسی موضوع پر ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالات لکھے گئے (۱۰۴)۔

اقبال کے روحانی جمہوریت کے تصور کے بارے میں ہمارے بیشتر اقبال شناس' جن میں فرزندِ اقبال' ڈاکٹر جاوید اقبال بھی شامل ہیں' کچھ اس قسم کے مبہم خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن میں ان کا عجز واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے اپنی تصانیف میں روحانی جمہوریت کے خدوخال پر کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالی' لیکن مظفر حسین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایسے معذرت خواہانہ سوالات کا جواب اپنی مستقل تصنیف ''پاکستان کی منزل مراد۔ روحانی جمہوریت'' میں پیش کیا ہے (۱۰۵)۔

مظفر حسین تسلیم کرتے ہیں کہ ''روحانی جمہوریت'' کی اصطلاح علامہ اقبال نے اپنی تحریروں میں اگرچہ فقط ایک ہی بار استعمال کی لیکن اسے اسلام کا مقصدِ اولیٰ (Ultimate Aim of Islam) قرار دے کر اپنے نظامِ افکار میں اسے انتہائی اہمیت کا حامل تصور بنا دیا۔ یہ اصطلاح ''اسلامی فکر کی تشکیلِ نو'' کے چھٹے خطبے کے بالکل آخر میں استعمال ہوئی ہے اور علامہ اقبال کے نزدیک یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو عصری تقاضوں کی روشنی میں اجتماعی کاوشوں سے معرضِ وجود میں آتا ہے (۱۰۶)۔

مظفر حسین نے اقبال کی مجموعی فکر کی روشنی میں ان کے تصورِ روحانی جمہوریت پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا ماحصل ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ روحانی جمہوریت محض ایک سیاسی تصور نہیں جیسا کہ بالعموم (جمہوریت کے نام کی وجہ سے) سمجھ لیا گیا ہے۔ ایک خالص دینی اور اسلامی تصور ہونے کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک تمدنی تصور کی ہے...... جس میں اللہ کی محبت اور مخلوقِ خدا کی محبت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں (۱۰۷)۔

حاصلِ بحث

مشرق ومغرب میں پھیلی ہوئی اقبال شناسی کی عالمی روایت' ایک متحرک اور توانا تحریک کے طور پر پوری بیسویں صدی میں اپنے گہرے اثرات مرتب کر کے اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔

گزشتہ اوراق میں اسی روایت کا ایک اجمالی مگر جامع مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف منطقوں میں تفہیم اقبال کے سلسلے میں کی جانے والی کاوشوں کا نہ صرف مجموعی جائزہ پیش کیا جائے بلکہ ان محرکات ورجحانات کا فہم بھی حاصل کیا جا سکے جو اس علمی روایت کے تسلسل کا باعث بنے۔ اور اس ضمن میں ان اہم اقبال شناسوں کی علمی کارگزاریوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے جنہوں نے بطور مترجم' مفسر' محقق' شارح' ناقد اور ترجمان اقبال کی حیثیت سے اس روایت کو اعتبار بخشا اور اقبال کے فکر وشعر کے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کیا' دوسروں کو بھی آگے بڑھنے' اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی ترغیب دی اور اپنا دیانتدارانہ علمی موقف پیش کرنے کا حوصلہ بخشا۔

اقبال شناسی کے فروغ میں جہاں مختلف ممالک کے اہل علم کی انفرادی کوششوں کو بڑا دخل حاصل ہے وہیں اقبال کے حوالے سے قائم ہونے والے اداروں کی علمی سرگرمیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر ان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور باقاعدہ علمی نشستوں اور سمعی بصری معاونات کے ذریعے سے افکار اقبال کا جس طرح چرچا کیا جاتا ہے وہ نوجوان نسل میں افکار اقبال کے ساتھ وابستگی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس ضمن میں ذرائع ابلاغ کا کردار بھی حوصلہ افزا رہا ہے۔

علمی درسگاہوں کے نصابات میں اقبالیات کے خصوصی مطالعہ کی شمولیت اور اعلیٰ تعلیمی درجوں میں اقبالیاتی تحقیق وتدوین کے منصوبے بھی اقبال شناسی کی روایت کے استحکام کا نہ صرف ذریعہ بنتے ہیں بلکہ نوجوان نسل کو قومی مقاصد سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

حکومتی سطح پر اقبالیاتی تحقیق میں نمایاں کام کرنے والے اسکالرز کی حوصلہ افزائی سے بھی دوسروں کو اس روایت کا حصہ بننے کی ترغیب حاصل ہوتی ہے اور اقبالیات میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔

اقبال ایک ایسا ہمہ گیر ذہن رکھنے والا شاعر، مفکر اور مصلح تھا جو اپنے عہد کی مختلف تحریکات اور رجحانات کا نہ صرف گہرا شعور رکھتا تھا بلکہ اس کے صحت مند عناصر کو جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھا۔ وہ اپنی تہذیبی روایات سے ربط قائم رکھتے ہوئے بھی عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہوا۔ اس کا تخلیقی وفور ایک تازہ بصیرت کے ساتھ اس کے فکر و شعر میں روشن ہو کر ابھرا جس نے مختلف اور بعض اوقات متضاد مکاتب فکر کو بھی اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اقبال کے بعض عقیدت منداس ''توجہ'' کو مشکوک سمجھتے ہیں، بعض اسے منفیت کے تنگ خانے میں ڈال کر اقبال کو محفوظ کرنے کا نام نہاد قومی فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اقبال کی فکری عظمت کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ مختلف اور متضاد مکاتب فکر نے اقبال کو اپنی تحقیق اور توجہ کا موضوع بنا کر ایک طرح سے اقبال شناسی کی روایت ہی کو وسعت اور ثروت بخشی ہے۔

اگر مغربی مستشرقین میں سے ڈاکٹر این میری شمل اور بعض دوسرے اصحاب اقبال کے فلسفہء خودی کی صوفیانہ تفسیر پیش کرتے ہیں اور روسی دانشور خاتون پولونسکایا اور ان کے ہم خیال دیگر اسکالرز کو اس فلسفہ میں نو آبادیاتی اور سامراجی غلامی سے آزادی کی جھلک نظر آتی ہے تو یہ ان کے اپنے مطالعہء اقبال کے نتائج فکر ہیں جن کو ہم کسی طور بھی اپنی امنگوں اور اپنی عقیدتوں کے تابع نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کو اقبال شناسی کی عالمی روایت کا حصہ بننے سے روک سکتے ہیں۔ علی شریعتی اگر افکار اقبال کو نغمہء انقلاب میں تبدیل کر دیتا ہے اور ہمارے بعض سرکاری دانشور افکار اقبال کو آمریت کے جواز کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو قصوروار کسی طرح سے بھی اقبال کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اقبال، علم، آزادی اور اجتہاد کا قائل تھا اور ہم نے اقبال شناسی کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے بھی اس کے انہی اصولوں کو رہنما بنایا ہے اور یقیناً اقبال شناسی کی روایت اکیسویں صدی میں بھی انہی اصولوں کی رہنمائی میں اپنا رستہ بناتے ہوئے نئی منزلوں کی طرف گامزن رہے گی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی،تحقیق اقبال کے ماخذ،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور۔۱۹۹۶۔ص ۹

۲۔ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی کے مطابق اقبال پر سب سے پہلا مضمون محمد دین فوق کا ہے جو اپریل ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں شائع ہوا۔دیکھئے اقبالیاتی جائزے،ص ۲۲،ص ۱۰۲۔

نیز دیکھئے تذکار اقبال (از منشی محمد دین فوق) مرتبہ محمد عبداللہ قریشی،بزم اقبال،لاہور جس میں ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء کے درمیان شائع ہونے والے ہر گلدستے میں اقبال کے کلام کے شائع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیکھئے ص ۳۶۔

۳۔نواب ذوالفقار علی خان کی یہ مختصر انگریزی کتاب "A Voice from the East" پہلی بار مرکنٹائل الیکٹرک پریس،لاہور سے ۱۹۲۲ء میں اور دوسری بار اقبال اکیڈمی پاکستان سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ہمارے پیش نظر اس کا ۱۹۸۲ء میں شائع ہونے والا ایڈیشن ہے۔

۴۔پیش لفظ "A voice from the East"،ص ا۔

۵۔ایضاً۔ص ا۔ ۶۔"A voice from the East"،ص ۴۰۔

۷۔مولوی احمد دین کی کتاب ''اقبال'' مرتبہ مشفق خواجہ،شائع کردہ انجمن ترقی اردو،پاکستان،کراچی ۱۹۷۹ء۔

۸۔مولوی احمد دین کے حالات،اقبال کے ساتھ ان کے تعلقات اور دیگر تفصیلات،''اقبال'' کے مرتب اور مقدمہ نگار،مشفق خواجہ کے جامع اور طویل مقدمہ سے اخذ کی گئی ہیں۔

۹۔تفصیلات کے لئے دیکھئے مقدمہ،''اقبال''۔

۱۰۔اقبال۔ص ۱۷۹،۱۸۰۔ ۱۱۔ایضاً،ص ۳۳۹۔

۱۲۔پروفیسر سید وقار عظیم نے ان تینوں اقبال نمبروں پر تفصیلی بحث کی ہے۔دیکھئے ''اقبالیات کا مطالعہ'' (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن،اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء،ص ۱۱۴ تا ۱۲۵۔

۱۳۔چراغ حسن حسرت (مرتبہ) اقبال نامہ،تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور،سن ندارد (دیباچہ اور بعض دوسرے

مضامین سے قیاساً ۱۹۴۰ء کا تعین ہوتا ہے)

۱۴۔ دیباچہ'اقبال نامہ' ص ۵۔

۱۵۔ دیباچہ'سیرت اقبال' قومی کتب خانہ' لاہور' طبع چہارم ۱۹۶۶ء' ص ۱۵۔

۱۶۔ تفصیل بحث کے لیے دیکھیے''سیرت اقبال'' ص ۲۸۹ تا ۳۶۵۔

۱۷۔ عبدالمجید سالک' ذکر اقبال' بزم اقبال لاہور' طبع دوم ۱۹۸۳ء' ص ۳۔

۱۸۔ دیکھیے اقبال نامہ' ص ۳۰' ۳۱۔ نیز یہی واقعہ''ذکر اقبال'' کے ص ۲۴۸ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۔ ذکر اقبال' ص ۲۴۷۔ ۲۰۔ دیباچہ'اقبال نامہ' ص ۱۰۔

۲۱۔ سید نذیر نیازی' دانائے راز' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۷۹ء' ص ذ' ح۔

۲۲۔ پروفیسر حمید احمد خاں' اقبال کی شخصیت اور شاعری' بزم اقبال' لاہور' طبع دوم' ۱۹۸۳ء۔

۲۳۔ محمد رفیق افضل (مرتبہ) گفتار اقبال' ادارہ تحقیقات پاکستان' دانشگاہ پنجاب' لاہور' طبع اول ۱۹۷۷ء۔

۲۴۔ دیکھیے مقدمہ' اقبال کی صحبت میں' مجلس ترقی ادب' لاہور' طبع اول' ۱۹۷۷ء۔

۲۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' سرگزشت اقبال (ایک محاکمہ) مکتبہ خیابان ادب' لاہور' ۱۹۷۹ء۔

۲۶۔ ڈاکٹر سلطان محمود حسین' مقدمہ' اقبال کی ابتدائی زندگی' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۸۶ء' ص ۹۔

۲۷۔ مصنف کی اطلاع کے مطابق مذکورہ تصنیف' اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے تحت زیر طبع ہے۔

۲۸۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے خیالات تفصیل سے''زندہ رود'' جلد اول (حیات اقبال کا تشکیلی دور) شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور کے پیش لفظ میں بیان کئے ہیں جو پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۲۹۔ پیش لفظ' زندہ رود۔ ۳۰۔ ایضاً ص ج' د۔ ۳۱۔ پیش لفظ' زندہ رود' جلد سوم۔

۳۲۔ صباح الدین عبدالرحمٰن کے''زندہ رود'' پر تبصرے کے لیے دیکھیے سہ ماہی اقبالیات (جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۵ء) اقبال اکادمی پاکستان' لاہور۔

۳۳۔ پروفیسر عزیز احمد کے سوانحی حالات، تصنیفات و تالیفات کے بارے میں تفصیلات کے لئے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مرتبہ "عزیز احمد" (کتابیات) شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۴۔ عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل، گلوب پبلشرز لاہور ۱۹۶۸ء ص ۷۔ ۳۵۔ ایضاً، ص ۷۔

۳۶۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۷۷ء ص ۲۰۵ تا ۲۴۷۔

۳۷۔ پروفیسر نظیر صدیقی، "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ایک اقبال شناس کی حیثیت سے" (مضمون) مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، انجمن ترقی اردو کراچی، اپریل ۲۰۰۰ء ص ۲۷۔

پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم نے جس افواہ کی طرف محض اشارہ کیا ہے اسے ڈاکٹر رضی کے بعض مداحوں نے تحریری صورت میں مشتہر بھی کیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے ایک مقالے ''موت و حیات۔ اقبال کے کلام میں'' جو ان کے مجموعے میں بھی شامل ہے، کو ایک الگ کتابچے کی صورت میں اقبال اکیڈمی، ایبک روڈ انارکلی لاہور کی طرف سے بھی شائع کیا گیا اور ابتداء میں ڈاکٹر رضی الدین سے تعارف میں یہ جملہ بھی شامل ہے: ''آپ نے آج سے چند سال قبل ریاضی میں ایک لاکھ روپے کا ''نوبل پرائز'' جیت کر دنیائے علم و سائنس میں شہرت دوام حاصل کی تھی''۔ تعارف کے آخر میں سید محمد شاہ، پروپرائٹر اقبال اکیڈمی کے الفاظ درج ہیں۔

۳۸۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین (دیباچہ) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول ۱۹۷۳ء ص ا۔

۳۹۔ اقبال کا تصور زمان و مکان، ص ۳۔ ۴۰۔ سید عبدالواحد، نقش اقبال، ص ۱۷۹۔

۴۱۔ اقبال کا تصور زمان و مکان، ص ۱۲۶، ۱۲۷۔

۴۲۔ مولانا محمد حنیف ندوی ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' (مضمون) المعارف، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، جنوری۔ فروری ۱۹۶۸ء ص ۱۰۹۔

۴۳۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا مضمون ''خلیفہ صاحب اور ان کے دینی تصورات'' سہ ماہی 'صحیفہ' مجلس ترقی ادب

لاہور کے تیسرے سال کے پہلے شمارہ میں شامل ہے (سن اشاعت ندارد) جس میں خلیفہ عبدالحکیم کی وفات کے بعد ایک گوشہ شائع کیا گیا تھا۔

۴۴۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور، طبع اول ۱۹۵۷ء۔

۴۵۔ پروفیسر محمد عثمان، خلیفہ عبدالحکیم اور اقبال (مضمون) مشمولہ اقبال کی نذر، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۔

۴۶۔فکر اقبال، ص ر ۴۷۔ایضاً، ص ر ۴۸۔ایضاً، ص ۳۶۰۔

۴۹۔ایضاً، ص ۴۰۹۔ ۵۰۔ایضاً، ص ۲۳۵۔

۵۱۔ڈاکٹر وحید عشرت، علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے تصورات عمرانی (جلد اول) بزم اقبال ۱۹۸۱ء، ص ۹، ۱۰، ۱۴۔

۵۲۔پروفیسر محمد عثمان، حیات اقبال کا ایک جذباتی دور اور دوسرے مضامین، مکتبہء جدید، لاہور، بار دوم ۱۹۷۵ء، ص ۵۵۔

۵۳۔ڈاکٹر انور سدید، مولانا صلاح الدین احمد اور اقبالیات، سہ ماہی اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور (جنوری۔مارچ ۱۹۸۸ء) ص ۱۴۰۔

۵۴۔صلاح الدین احمد، اقبال کے دس شعر، اکادمی پنجاب ''ادبی دنیا'' لاہور، بار اول، ۱۹۵۸ء، ص ۳۔

۵۵۔ڈاکٹر سید عبداللہ، مقدمہ، تصورات اقبال، المقبول پبلی کیشنز، لاہور، بار سوئم ۱۹۶۹ء، ص ۲۔

۵۶۔ڈاکٹر محمد معز الدین کے ساتھ ہونے والی یہ تفصیلی گفتگو بعد میں مولانا نعیم صدیقی کے مجموعہ مقالات و مضامین ''اقبال کا شعلہ نوا'' میں شامل کر دی گئی جسے الفیصل لاہور کی طرف سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر معز الدین کے ساتھ اس گفتگو میں مولانا نعیم صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ زکریا، طاہر شادانی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور پروفیسر تحسین فراقی بھی شریک تھے۔دیکھئے کتاب مذکور ص ۱۶۷ تا ۱۸۸۔

۵۷۔ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، پروفیسر محمد منور (مضمون) سہ ماہی اقبالیات (جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء) اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ص ۱۱۸۔

۵۸۔پروفیسر محمد منور، حرف آغاز، میزان اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۲ء، ص ۱۳، ۱۴۔

۵۹۔ پروفیسر محمد منور، برہان اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۴۶۔

۶۰۔ سال اقبال ۲۰۰۲ء کے سلسلہ میں شائع ہونے والی ڈاکٹر سلیم اختر کی اس کتاب میں ان کے ۳۸ مضامین و مقالات شامل ہیں۔ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔

۶۱۔ دیباچہ از جگن ناتھ آزاد، ص ۸۔

۶۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، مشمولہ اقبال، شخصیت، افکار و تصورات، مطالعہ کا نیا تناظر، ص ۳۹۹۔

۶۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال کی فکری میراث، بزم اقبال لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۹۔ نیز ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے عنوان سے اپنے مقالے میں اٹلی، افغانستان، امریکہ، انڈونیشیا، تیونس، جاپان، جرمنی، چیکوسلواکیہ، روس، ازبک، تاجیک، سری لنکا، سعودی عرب، سکاٹ لینڈ، سویڈن، شام، فرانس، فلپائن، فن لینڈ، کینیڈا، لبنان، مراکش اور مصر میں اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات کی فہرست درج کی ہے۔ دیکھئے مطالعہ کا نیا تناظر، ص ۲۹۰ تا ۳۲۸، اس کے علاوہ ''ایران میں اقبال شناسی کی روایت'' کے عنوان سے ان کی الگ ایک پوری کتاب شائع ہو چکی ہے جبکہ لوس کلوڈ میتیخ کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ''فکر اقبال کا تعارف'' کے عنوان سے (مُلا عبدالمجید ڈار کے انگریزی ترجمہ کی بنیاد پر) کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں بھی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے بالترتیب ۱۹۸۲ء، ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

۶۴۔ اقبال کی فکری میراث، ص ۱۴، ۱۵۔

۶۵۔ پروفیسر ایوب صابر کی یہ تحقیقی تصنیف جنگ پبلشرز لاہور کی طرف سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔

۶۶۔ اقبال کا شعلہ نوا، ص ۲۸۰۔

۶۷۔ ڈاکٹر محمد اجمل کا مضمون ''اقبال ایک ماہر نفسیات کی نظر میں'' ان کے مجموعہ مقالات ''مقالات اجمل'' میں شامل ہے جسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔

۶۸۔ اقبال کا شعلہ نوا، ص ۲۷۹۔

۶۹۔ پروفیسر سید علی عباس جلالپوری، اقبال کا علم کلام، خرد افروز، جہلم، بار دوم۔ ص ۱۱۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۵۔ ۷۱۔ ایضاً، ص ۱۶، ۱۷۔

۷۲۔سلیم احمد' اقبال ایک شاعر' قوسین لاہور' بار دوم ۱۹۸۷ء۔ص ۱۵۔ ۷۳۔ایضاً' ص ۲۸۔

۷۴۔دیکھیے پیش لفظ' اقبال ایک شاعر' ص ۹۔ ۷۵۔اقبال ایک شاعر' ص ۲۹۔

۷۶۔ایضاً' ص ۲۵۔ ۷۷۔مقدمہ' اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ' ص ۹۔

۷۸۔بزم اقبال' لاہور کی طرف سے یہ مجموعہ ۱۹۵۷ء میں پہلی بار طبع ہوا جس میں میاں محمد شریف' تاج محمد خیال' بشیر احمد ڈار' مظہر الدین صدیقی' سید عابد علی عابد' عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر حسن کاظمی کے انگریزی مضامین کو اردو تراجم کی صورت میں یکجا کیا گیا تھا۔

۷۹۔یہ مجموعہ ۱۹۶۸ء میں پہلی بار فیروز سنز لمیٹڈ لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا۔

۸۰۔ممتاز سکالرز کے آٹھ مقالات کا یہ انگریزی مجموعہ شیخ محمد اشرف نے لاہور سے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا اور اس کے بعد بھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔اس مجموعے میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی' خواجہ غلام السیدین' میاں محمد شریف' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' فضل الرحمٰن' ڈاکٹر عزیز احمد اور فیاض محمود کے مقالات شامل ہیں۔

۸۱۔علامہ اقبال (ممتاز حسن کی نظر میں) مرتبہ ڈاکٹر محمد معزالدین (۱۹۸۱ء) اور علامہ اقبال (صوفی تبسم کی نظر میں) اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے جبکہ مقالات یوسف سلیم چشتی (مرتبہ اختر النساء) ۱۹۹۹ء میں بزم اقبال کی طرف سے شائع ہوئی۔

۸۲۔دیکھیے راقم کا مضمون' پاکستان میں اقبال شناسی' مجلہ تحقیق نامہ' شعبہ اردو' گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور' ص ۲۸ تا ۳۷۔نیز یہی مضمون ماہنامہ قومی زبان' کراچی کی اشاعت اپریل ۲۰۰۳ء میں بھی شامل ہے۔

۸۳۔راقم نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت کا تفصیلی تجزیہ اپنے ایک مضمون بعنوان ''اقبال اور فرزند اقبال'' (اپنا گریبان چاک کے تناظر میں) میں پیش کیا ہے جو مجلہ ''راوی'' گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی اشاعت ۲۰۰۲ء میں بھی شامل ہے۔

۸۴۔عبدالحمید کمالی' ڈاکٹر رفیع الدین کا نظریہء داعیہ الی العین (مضمون) مشمولہ دوماہی ''اسلامی تعلیم'' (ڈاکٹر محمد رفیع الدین نمبر)' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور' نومبر۔دسمبر ۱۹۷۳ء' ص ۲۵۔ عبدالحمید کمالی نے ۱۸۵۷ء کے بعد اسلامی نشاۃ نو کے لئے پہلے طبقے میں سرسید' مولانا قاسم نانوتوی اور ان

کے رفقاء دوسرے طبقے میں امیر علی شبلی نعمانی چراغ علی جیسے اکابرین اور تیسرے طبقے میں عبدالماجد دریا بادی ابوالکلام آزاد اور اقبال کو شامل کیا ہے۔

۸۵۔ مقدمہ تعلیم کے ابتدائی اصول (اردو ترجمہ) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۸ء ص ۱۰'۱۱'۱۲۔

۸۶۔ ماہنامہ کتاب بک فاؤنڈیشن لاہور جولائی اگست ۱۹۷۰ء ص ۳۲۔

۸۷۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تصنیف ''حکمت اقبال'' پہلی بار علمی کتب خانہ لاہور کی جانب سے شائع ہوئی تو اس کے ٹائٹل پر یہی عبارت درج تھی۔ سن اشاعت درج نہیں تھا لیکن چونکہ مختلف تحریروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کی وفات (۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء) سے چند ماہ پہلے شائع ہوئی لہٰذا اس کا سال اشاعت ۱۹۶۹ء ہی تسلیم کیا جانا چاہیے۔

۸۸۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے ''حکمتِ اقبال'' پر تبصرہ کے لیے دیکھیے ماہنامہ کتاب ص ۳۲۔

۸۹۔ ایضاً ص ۳۴۔

۹۰۔ اس ضمن میں دیکھیے حاجی سردار محمد (مرحوم) کے خیالات جو انہوں نے کتاب کی تعارفی تقریب میں بیان کئے دیکھیے ماہنامہ کتاب ص ۳۴'۳۵۔

۹۱۔ مرزا محمد منور تبصرہ در ''حکمت اقبال'' سہ ماہی مجلّہ ''اسلامک ایجوکیشن'' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور ص ۱۱۲۔

۹۲۔ دیباچہ حکمت اقبال ص ا۔

۹۳۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا انگریزی مقالہ: "Iqbal's Idea of the Self" مجلّہ اقبال لاہور جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا (ص ۱ تا ۲۸) اقبال کا فلسفہ اردو اور انگریزی زبانوں میں اقبال ریویو کراچی کے شمارہ اپریل ۱۹۶۰ء اور اکتوبر ۱۹۶۱ء کی اشاعتوں میں شامل ہے۔ اقبال کا تصور ارتقاء (انگریزی) اقبال ریویو اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا (ص ۲۰ تا ۴۲)۔

۹۴۔ حکمت اقبال ص ۲۔ ۹۵۔ ایضاً ص ۸۔

۹۶۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین دیباچہ حکمت اقبال علمی کتاب خانہ لاہور سن اشاعت ندارد۔

۹۷۔مظفر حسین' دیباچہ'اساس فکر اقبال' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'لاہور' تاریخ ندارد'ص ۱۱۔

۹۸۔ڈاکٹر محمد رفیع نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور کے حوالے سے ایک خط میں مولانا سید ابوالحسن ندوی کو لکھا کہ ''ادارہ کے انتظامی بورڈ نے میری تجویز اور سفارش کے مطابق (مظفر حسین) کو میرا جانشین مقرر کر دیا ہے جو اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کر رہے ہیں''۔مولانا ندوی نے یہ خط مولانا عبدالماجد دریا بادی کو بھیج دیا' جنہوں نے اس خط کو ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے تعارف کے ساتھ ''صدقِ جدید'' کی اشاعت ۲۶ مئی ۱۹۶۷ء میں شامل کر لیا۔

۹۹۔مظفر حسین کے کالموں کا ضخیم انتخاب ''خیال در خیال'' کے عنوان سے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور کی جانب سے اگست ۲۰۰۴ء میں شائع کیا گیا۔

۱۰۰۔اداریہ'روزنامہ ''پاکستان'' لاہور' ۲۳ جولائی ۲۰۰۳ء۔

۱۰۱۔دیکھیے مظفر حسین کی مرتبہ ''سائنس کی دینیات'' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور (۱۹۸۴ء اور ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی) میں شامل مقالات' قرآن حکیم اور سائنسی انداز فکر' سائنس بطور تصوف' اقبال کا اجتہاد' سائنس اور تبلیغ اسلام اور سائنس کی دینیات۔مزید برآں ان کی تصنیف' اساس فکر اقبال (شائع کردہ اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور) میں شامل مضمون سائنس اور اقبال۔

۱۰۲۔ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ ''متعلقات خطبات اقبال'' کو اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۱۰۳۔دیکھیے دیباچہ' متعلقات خطبات اقبال۔

۱۰۴۔دیکھیے ڈاکٹر نعیم احمد کی تصنیف ''اقبال کا تصور بقائے دوام'' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور ۱۹۔

۱۰۵۔مظفر حسین کی تصنیف ''پاکستان کی منزل مراد۔روحانی جمہوریت'' سالِ اقبال کی نسبت سے اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور نے ۲۰۰۲ء میں شائع کی۔

۱۰۶۔ایضاً' ص ۱۳۔ ۱۰۷۔ایضاً' ص ۳۰۱۔

کتابیات(Bibliography)

(متعلقہ کتب)

آصف اعوان، ڈاکٹر محمد: اقبال کا تیسرا خطبہ تحقیقی و توضیحی مطالعہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۶ء۔

آصف جاہ کاروانی، ڈاکٹر: اقبال کا فلسفۂ خودی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۷ء۔

اجمل، ڈاکٹر محمد: مقالاتِ اجمل، مرتبہ شیما مجید، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

احمد دین، مولوی: اقبال (مرتبہ مشفق خواجہ)، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

احمد میاں اختر جوناگڑھی، قاضی: اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی، پاکستان، کراچی، طبع دوم، ۱۹۶۵ء۔

اسلوب احمد انصاری: اقبال کی تیرہ نظمیں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

افتخار حسین، آغا: یورپ میں اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

اقبال، (علامہ) محمد: علم الاقتصاد، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، ۱۹۷۷ء۔

" : اسرارِ خودی، حکیم محمد چشتی، یونین سٹیم پریس، لاہور، 1915ء۔

" : کلیاتِ اقبال (اردو)، اقبال اکادمی، لاہور، عوامی ایڈیشن۔

" : ڈاکٹر صابر کلوروی (مرتبہ) کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال (متروک اردو کلام)، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

" : منشوراتِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۸ء۔

اکرام چغتائی، محمد: مرتبہ اقبال اور گوئٹے، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۱ء۔

ایوب صابر، پروفیسر: اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ، انسٹی ٹیوٹ آف اقبال سٹڈیز، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

باری علیگ: کارل مارکس، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۵ء۔

ثاقب رزمی: اقبال کی انقلابیت، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

جابر علی سید، پروفیسر: اقبال کا فنی ارتقاء، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۷۸ء۔

جاوید اقبال، جسٹس ڈاکٹر: زندہ رود (تین جلدیں)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، لاہور، جلد اول (تشکیلی دور) ۱۹۷۹ء، جلد دوم (وسطی دور) ۱۹۸۱ء، جلد سوم (اختتامی دور) ۱۹۸۴ء۔

" اپنا گریباں چاک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

جگن ناتھ آزاد: اقبال اور اس کا عہد، الادب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

" اقبال اور مغربی مفکرین، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

چراغ حسن حسرت (مرتبہ): اقبال نامہ، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، س۔ن۔

حسین محمد جعفری، ڈاکٹر سید (مرتبہ): اقبال فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۱۹۸۸ء۔

حمید احمد خاں، پروفیسر: اقبال کی شخصیت اور شاعری، بزمِ اقبال، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۳ء۔

حمید نسیم: علامہ اقبال ہمارے عظیم شاعر، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۳ء۔

خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر: حکمتِ رومی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء۔

" فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، بار سوم ۱۹۶۴ء۔

خلیق انجم (مرتبہ): جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات)، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء۔

رحیم بخش شاہین (مرتبہ): اوراقِ گم گشتہ، اسلام پبلی کیشنز، لاہور، بار دوم، ۱۹۷۹ء۔

رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر: اقبال کا تصورِ زمان و مکان اور دوسرے مضامین، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

رفیع الدین، ڈاکٹر محمد: پاکستان کا مستقبل، شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب، لاہور، س۔ن۔
طبع دوم، آل پاکستان اسلام ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

.........".. .. .... : قرآن اور علم جدید، طبع اول، ۱۹۵۱ء، دیگر ایڈیشن (۱۹۵۹ء، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۶ء) آخرالذکر ایڈیشن، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا۔

.. .. " .. .. : روحِ اسلام، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، تیسرا ایڈیشن (کتابی صورت میں)، ۱۹۹۳ء۔

.. ". . .... : حکمتِ اقبال، علمی کتاب خانہ، لاہور، س۔ن۔

طبع دوم، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور و ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء۔

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر (مرتبہ): اقبال شناسی اور محور، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

.. ".......... : اقبالیاتی جائزے، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

........" .. .. : تحقیقِ اقبال کے ماخذ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

سعید احمد اکبر آبادی، مولانا: خطباتِ اقبال پر ایک نظر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع ثانی، ۱۹۸۷ء۔

سعید اختر درانی، ڈاکٹر: اقبال یورپ میں، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، طبع ثانی، ۱۹۹۹ء۔

سلطان محمود حسین، ڈاکٹر: اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

سلیم احمد: اقبال ایک شاعر، قوسین، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

سلیم اختر، ڈاکٹر (مرتبہ): اقبال ہمہ روحِ عالم، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

.. . . " . . (مرتبہ): ایران میں اقبال شناسی کی روایت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

.........." . . .. : اقبال کی فکری میراث، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

.... .. ".. .. .. (مرتبہ): علامہ اقبال شخصیت، افکار و تصورات، مطالعہ کا نیا تناظر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

شاہد اقبال، کامران: اقبالیات درسی کتب میں، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔

شریف، میاں محمد: مقالاتِ شریف، بزمِ اقبال، لاہور،۱۹۹۴ء۔

شوکت علی شاہ، سید (مرتبہ): اردو زبان، مسائل اور مجلس تقریبات ملی، لاہور،۱۹۹۲ء۔

شورش کاشمیری، آغا: اقبال پیامبرِ انقلاب، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

صدیق جاوید، ڈاکٹر: اقبال نئی تفہیم، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳ء۔

صلاح الدین احمد، ڈاکٹر: اقبال کے دس شعر، اکادمی پنجاب، ادبی دنیا، لاہور، ۱۹۵۸ء۔

......"...... تصوراتِ اقبال، المقبول پبلی کیشنز، لاہور، بار سوئم، ۱۹۶۹ء۔

طاہر فاروقی، پروفیسر: سیرتِ اقبال، قومی کتب خانہ، لاہور، طبع چہارم، ۱۹۶۶ء۔

عبدالسلام ندوی، مولانا: اقبالِ کامل، مکتبہ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

عبدالمجید سالک: ذکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، طبع دوم،۱۹۸۳ء۔

......"...... سرگزشت، الفیصل تاجران ناشران کتب، لاہور،۱۹۹۳ء۔

عبدالمغنی، ڈاکٹر: اقبال کا نظامِ فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع ثانی، ۱۹۹۰ء۔

......"...... اقبال کا نظریہ خودی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء۔

عبداللہ چغتائی: اقبال کی صحبت میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

عبدالواحد معینی، سید: نقشِ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

عبداللہ، ڈاکٹر سید: سہلِ اقبال، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

......"......(مرتبہ) متعلقاتِ خطباتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

عثمان، پروفیسر محمد: حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور اور دوسرے مضامین، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

......"...... فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

عزیز احمد: اقبال نئی تشکیل، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

عشرت حسن انور، ڈاکٹر: اقبال اور مشرق و مغرب کے مفکرین، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

علی سردار جعفری: اقبال شناسی، پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

علی عباس جلال پوری: مقالاتِ جلال پوری، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

" اقبال کا علمِ کلام، خرد افروز، جہلم، ۱۹۸۷ء۔

" کائنات اور انسان، خرد افروز، جہلم ۱۹۸۹ء۔

" خرد نامہ جلالپوری، خرد افروز، جہلم، ۱۹۹۳ء۔

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

غلام ربانی اگرو (مرتبہ): بھارت میں اردو، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

فتح محمد ملک، ڈاکٹر: اندازِ نظر، التحریر، لاہور، ۱۹۸۰ء۔

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اقبال سب کے لیے، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۸ء۔

فقیر محمد فقیر: پنجابی زبان وادب کی تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

فوق، منشی محمد دین: تذکار اقبال (مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی)، بزمِ اقبال، لاہور، س۔ن۔

کنیز فاطمہ یوسف، ڈاکٹر: اقبال اور عصری مسائل، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

مجنوں گورکھپوری: اقبال (اجمالی تبصرہ)، ایوانِ اشاعت، گورکھپور/سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، س۔ن۔

محمد ریاض، ڈاکٹر: افکار اقبال، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

محمد منور، پروفیسر: اقبال کی فارسی غزل، ایوانِ اردو، کراچی، ۱۹۷۷ء۔

" میزانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۲ء۔

" برہانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۵ء۔

" قرطاسِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۰ء۔

مختار مسعود: لوحِ ایام، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، طبع ہفتم، ۱۹۹۸ء۔

مسعود حسین خاں: ہندوستانی ادب کے معمار یوسف حسین خان، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء۔

مظفر حسین (مرتبہ): سائنس کی دینیات، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

........"........ فکرِ اقبال کے دو بنیادی تصورات خودی اور آخرت، اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

........"........ پاکستان تجربہ گاہِ اسلام، نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

........"........ روحانی جمہوریت، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

........"........ اساسِ فکرِ اقبال، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، س۔ن۔

........"........ خیال در خیال، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

مظفر حسین، ڈاکٹر: بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے، المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکزِ تحقیق و تالیف، گجرات، ۲۰۰۳ء۔

معزالدین، ڈاکٹر (مرتبہ): علامہ اقبال ممتاز حسن کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء۔

معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید: جامعات میں اقبال کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

........"........ جہانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

منصور گل، ریاض طاہر، (مرتبین): اقبال اور مسیحی مشاہیر، فل گاسپل اسمبلیز آف پاکستان، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

منظور احمد، ڈاکٹر: اقبال شناسی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

میر ولی الدین، ڈاکٹر: رموزِ اقبال، کتاب منزل، لاہور، طبع دوم، ۱۹۵۰ء۔

میکش اکبر آبادی: نقدِ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء۔

نذیر نیازی، سید: دانائے راز، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

نسیم، ڈاکٹر الف د: موجِ نسیم فی مطالب ارمغانِ حجاز، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن۔

نصیر احمد ناصر: جمالیات (قرآن حکیم کی روشنی میں)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۸ء۔

" تاریخ جمالیات (۲ جلدیں)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء۔

" اقبال اور جمالیات، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۴ء۔

نعیم احمد، ڈاکٹر: اقبال کا تصور بقائے دوام، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

نعیم صدیقی، مولانا: اقبال کا شعلۂ نوا، الفیصل، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

وارث میر، پروفیسر: حریت فکر کے مجاہد، جنگ پبلشرز، لاہور، اشاعت دوم، ۱۹۹۰ء۔

وحید الدین، سید: فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں)، نذیر سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

وحید رضا بھٹی (مرتبہ): اقبال کی نذر، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

وحید عشرت، ڈاکٹر: علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے تصوراتِ عمرانی (جلد اول)، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۱ء۔

" (مرتبہ): زمان و مکان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

" پاکستان میں اقبالیات کا مطالعہ، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتبہ): منتخب مقالات (اقبال ریویو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

وزیر آغا، ڈاکٹر: تصورات عشق و خرد (اقبال کی نظر میں)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، س۔ن۔

وقار عظیم، پروفیسر، سید: اقبالیات کا مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

یعقوب توفیق (مرتبہ): مقالاتِ یومِ اقبال، اقبال کونسل، کراچی، ۱۹۶۸ء۔

یوسف حسین خان، ڈاکٹر: روحِ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

" غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: شرح اسرارِ خودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س۔ن۔

" شرح ارمغانِ حجاز، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س۔ن۔

اردو تراجم

(انگریزی، عربی، فارسی اور دیگر زبانوں سے)

ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید: نقوشِ اقبال، ترجمہ: مولوی شمس تبریز خان، مجلس نشریات اسلام، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۸۸ء۔

اقبال، (علامہ) محمد: فلسفہ عجم، ترجمہ: میر حسن الدین، نفیس اکیڈمی، کراچی، چھٹا ایڈیشن، ۱۹۸۶ء۔

............"............ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ: سید نذیر نیازی، بزمِ اقبال، لاہور، طبع سوم، ۱۹۸۶ء۔

............"......... .. مقالاتِ اقبال، (مرتبہ) سید عبدالواحد معینی، آئینہ ادب، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۸ء۔

............"...... .. .. شذراتِ فکرِ اقبال، ترجمہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

............"............ گفتارِ اقبال، (مرتبہ) محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

............"........ ... حرفِ اقبال، لطیف احمد خان شیروانی (ترتیب و ترجمہ)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء۔

.. ..".......... اقبال کے خطوط جناح کے نام، ترتیب و تہذیب: محمد جہانگیر عالم، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۲ء۔

....".... ..... کلیاتِ مکاتیب اقبال (جلد دوم)، (مرتبہ) مظفر حسین برنی، ترتیب پبلشرز، لاہور، س۔ن۔

... .".. .. .. .. اسلامی فکر کی نئی تشکیل، مترجم: شہزاد احمد، مکتبہ خلیل، س۔ن۔

پروین شوکت علی، ڈاکٹر: اقبال کا فلسفۂ سیاست، ترجمہ: مولانا ریاض احسن عباسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن۔

خامنہ ای، آیت اللہ، سید علی: اقبال مشرق کا بلند ستارہ، ترجمہ: ڈاکٹر سید محمد اکرم، دفتر ثقافتی نمائندہ، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء۔

رحمٰن، جسٹس ایس اے: ترجمانِ خودی (اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ)، مکتبۂ کارواں، لاہور، طبع دوم، ۱۹۶۷ء۔

رفیع الدین، ڈاکٹر محمد: تعلیم کے ابتدائی اصول (دو جلدیں)، ترجمہ: مولوی سبطین احمد بدایونی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، جلد اول ۱۹۶۸ء، جلد دوم ۱۹۶۹ء۔

...... " ......: منشورِ اسلام، ترجمہ: ڈاکٹر ابصار احمد، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

شمل، ڈاکٹر این میری: شہپرِ جبریل، ترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

عبدالحکیم، ڈاکٹر، خلیفہ: اسلام کا نظریۂ حیات، تربمہ: قطب الدین احمد، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع سوم، ۱۹۸۳ء۔

عزیز احمد: برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۷ء۔

...... " ......: برصغیر میں اسلامی کلچر، ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

علی شریعتی، ڈاکٹر: علامہ اقبال (مصلح قرنِ آخر)، مترجم: کبیر احمد جائسی، فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

...... " ......: ہم اور اقبال، ترجمہ: جاوید احمد قزلباش، دفتر ثقافتی قونصلر، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء۔

فینن، فرانز: افتادگانِ خاک، ترجمہ: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

میتھ، لوس کلوڈ: فکرِ اقبال کا تعارف، ترجمہ: ڈاکٹر سلیم اختر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

نتالیا پری گارنیا. غالب، ترجمہ: محمد اسامہ فاروقی، دانیال، کراچی، ۱۹۹۸ء۔

رسائل و جرائد

احساس	پشاور	جلد۲، شمارہ ۱۱، ۱۲
اردو (سہ ماہی)	کراچی	اپریل جون ۱۹۸۷ء
اسلامک ایجوکیشن (دو ماہی/سہ ماہی)	لاہور	مارچ، اپریل ۱۹۶۸ء
............"............	لاہور	اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۷۰ء
اسلامی تعلیم (دو ماہی)	لاہور	نومبر، دسمبر ۱۹۷۰ء
............"............	لاہور	اپریل جون ۱۹۷۱ء
............"............	لاہور	جنوری، فروری ۱۹۷۲ء
افکار (ماہنامہ) (علی سردار جعفری نمبر)	کراچی	نومبر، دسمبر ۱۹۹۱ء
اقبال (سہ ماہی)	لاہور	جنوری ۱۹۵۳ء
............"............	لاہور	اکتوبر ۱۹۸۱ء
............"............	لاہور	اکتوبر ۱۹۹۱ء
............"............	لاہور	جولائی، ستمبر ۲۰۰۶ء
اقبال ریویو	کراچی	اپریل، جولائی ۱۹۶۰ء
............"............	کراچی	جنوری ۱۹۶۱ء
............"............	کراچی	جولائی ۱۹۶۳ء

..........."...........	کراچی	جنوری ۱۹۶۵ء
اقبال ریویو	لاہور	جنوری ۱۹۷۹ء
اقبال ریویو	حیدر آباد (دکن)	نومبر ۲۰۰۳ء
اقبالیات (سہ ماہی)	لاہور	جولائی، دسمبر ۱۹۸۵ء
..........."...........	لاہور	جنوری، مارچ ۱۹۸۸ء
..........."...........	لاہور	جنوری ۱۹۹۲ء
..........."...........	لاہور	جنوری، مارچ ۱۹۹۷ء
..........."...........	لاہور	جولائی، ستمبر ۱۹۹۹ء
..........."...........	لاہور	جولائی ۲۰۰۰ء
الفاظ (دوماہی)	علی گڑھ	مارچ، جون ۱۹۸۰ء
المعارف (سہ ماہی)	لاہور	جنوری، فروری ۱۹۶۸ء
اورینٹل کالج میگزین (جشنِ اقبال نمبر)	لاہور	شمارہ مسلسل ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱
تحقیق نامہ	جی سی یو، لاہور	۲۰۰۳ء
..........."...........	جی سی یو، لاہور	۲۰۰۴ء
تخلیقِ مکرر (اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں)	جی سی یو، لاہور	۲۰۰۲ء
ثقافت (ماہنامہ)	لاہور	فروری ۱۹۶۵ء
راوی	گورنمنٹ کالج، لاہور	۲۰۰۲ء
زندگی (ہفت روزہ)	لاہور	۲۲ دسمبر ۱۹۷۰ء
صحیفہ (سہ ماہی) اقبال نمبر	لاہور	اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۲ء

SELECTED BIBLIOGRAPHY

(ENGLISH PUBLICATIONS)

Arberry, A.J.:	Notes on Iqbal's Asrar-i-Khudi, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1977.
Asloob Ahmad Ansari (Ed):	Iqbal - Essays and Studies, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 2004.
Chaughtai, Muhammad Ikram: (Edu.)	Iqbal - New Dimensions, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2003.
Chaughtai, Muhammad Ikram & M. Sohail Umar (Edu.):	Bibliography and Here the Twain Did Meet, Iqbal Academy, Pakistan, Lahore, 2003.
Huntington, Samuel, P.:	The Clash of Civilizations, Touchstone, New York, 1997.
International Islamic Colloquium Papers:	(Dec. 29, 1957, Jan. 8, 1958): University of the Punjab, Lahore.
Maitre Luce Claude:	Introduction to the Thought of Iqbal - (A Collection of Articles by Soviet Scholars) People's Publishing House, Lahore, 1983.
Muhammad Iqbal - Poet and Philosopher:	Pakistan German Forum Pakistan, Karachi, 1960.
Munawar, Prof. Muhammad:	Iqbal Century Papers (Vol-1), University of the Punjab, Lahore, 1982.
--do--	Iqbal and Quranic Wisdom, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 3rd Edition, 1992.
--do--	Iqbal-Poet and Philosopher, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 3rd Edition, 1992.
Nicholson, R.A.:	The Secrets of the Self, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 8th Edition, 1972.

Rafi-ud-Din, Dr. Muhammad:	Ideology of the Future, Mangotra Printing Press, Jammu, 1946. 2nd Edition Din Muhammadi Press, Karachi, 1956 and other editions.
--do--	Manifesto of Islam, Din Muhammadi Press, Karachi, N.M. 2nd Edition, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1973.
--do--	First Principles of Education, Iqbal Academy Pakistan, Karachi. 2nd Edition Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1983.
--do--	A Specimen-Text Book of Physics of Intermediate Classes, All Pakistan Islamic Education Congress, Lahore, 1972.
--do--	Essence of Islam, Eng. Tr. S.D. Muhammad, Rafi-ud-Din Foundation, Lahore, 2004.
Sardar, Dr. Zia-ud-Din:	Islamic Features, New York, 1985.
--do--	The Future of Muslim Civilization, Haider Ali Muljee Taha, Karachi.
Schimmel, Dr. Annemarie:	Gabriel's Wing, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1989.
Sinha, Dr. Sachdinand:	Iqbal-The Poet and his Message, Ram Narayan Lal Publishers and Book Sellers, Allahabad, 1947.
Zulfiqar Ali Khan, Nawab:	A Voice from the East, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 3rd Edition. 1982.

English Magazines & Journals

Explorations (Iqbal Century Issue), Govt. College, Lahore, 1977.

Iqbal Review (Quarterly), Karachi, April 1961.

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور

اردو مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
افکار پریشاں	ایم۔آر۔کیانی	200.00
ایک جج ہنس بھی سکتا ہے شاید!	ایم۔آر۔کیانی	100.00
اک محشرِ خیال	افتخار احمد عدنی	80.00
غالب شناسی کے کرشمے	افتخار احمد عدنی	200.00
غالب کی فارسی غزلوں سے انتخاب ترجموں کے ساتھ	اردو ترجمہ افتخار احمد عدنی، انگریزی ترجمہ رالف رسل	300.00
اے مرے دشتِ سخن	جمیل الدین عالی	200.00
ارمغانِ عالی	جمیل الدین عالی	300.00
لاحاصل	جمیل الدین عالی	130.00
غزلیں، دوہے، گیت	جمیل الدین عالی	170.00
جیوے جیوے پاکستان	جمیل الدین عالی	100.00
آئس لینڈ (سفرنامہ اور مریخ نامہ)	جمیل الدین عالی	300.00
بس اک گوشۂ بساط (خاکے، مضامین اور تاثرات)	جمیل الدین عالی	350.00
دوہے	جمیل الدین عالی	450.00
خامہ بگوش کے قلم سے (مجموعہ کالم مشفق خواجہ)	مظفر علی سید (مرتب)	225.00
دبستانِ نظام	ڈاکٹر اسلم فرخی	350.00
نظام رنگ	ڈاکٹر اسلم فرخی	100.00
فرید و فردِ فرید	ڈاکٹر اسلم فرخی	100.00
صاحب جی سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	100.00
سات سمندر پار	اختر ریاض الدین احمد	150.00
دھنک پر قدم	اختر ریاض الدین احمد	120.00
پھول کی زبانی	نجمہ انوار الحق	80.00
ابنِ خلدون اور جدید تعلیمی نظریات	فہمیدہ عتیق	120.00
نذرِ خسرو (پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور منتخب اشعار)	ڈاکٹر شان الحق حقی	100.00
تاریخ علومِ اسلامیہ (۳ جلدی سیٹ)	فواد محمد سزگین، مترجم شیخ نذیر حسین	800.00
کہاں گئے وہ لوگ	محمد عمر	150.00
سید حسن غزنوی (حیات اور ادبی کارنامے)	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	250.00
تاریخ مشغلہ	محمد اکرام چغتائی	36.00
پھر (شاعری)	زبیر وحید	100.00
فنِ مصوری (منتخب مضامین)	مرتبہ: شیما مجید	280.00
شیفتہ..... ایک مطالعہ	مرتبہ: شیما مجید	180.00
غالب..... نقش ہائے رنگ رنگ	افتخار احمد عدنی	300.00
اردو ناول اور آزادی کے تصورات	پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف	680.00
پاکستان میں تعلیم ایک تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر انجم رحمانی	650.00
مجید امجد نقش گرِ ناتمام	ڈاکٹر سید عامر سہیل	350.00
ن۔م۔راشد کے خطوط	نسیم عباس احمر	250.00
پاکستان میں مصوری	عابد حسین قریشی	430.00
یادیں	افتخار احمد عدنی	250.00
محمد اسد: ایک یورپین بدوی	مرتبہ محمد اکرام چغتائی	600.00
مغرب کے عظیم فلسفی	عبدالروف ملک	280.00
ادبی تاریخ نویسی	مرتبین: ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر	500.00
فیض احمد فیض رومان اور شاعری	پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف	250.00
احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک	محمد عباس طوروی	300.00
سرِ بازار می رقصم	محمد نواز خان میرانی	240.00

ENGLISH PUBLICATIONS

Title	Author	Price
The Whole Truth	M.R. Kayani	300.00
A Judge May Laugh	M.R. Kayani	100.00
Some More Truth	M.R. Kayani	100.00
Not the Whole Truth	M.R. Kayani	175.00
Destination Beyond Destination	Jamiluddin Aali	300.00
Revolutionary Legality in Pakistan	Justice (Retd) Anwar-ul-Haq	260.00
International Law	Dr. Saiyyad Muhammad Saleem Moini	800.00
Art in Pakistan	Ashfaq Rasheed	1500.00

BOOK CENTRE
ART GALLERY

70 - Shara-e-Quaid-e-Azam, Lahore.
Phone: 042-37321161, 37322926

ISBN 978-969-8460-20-4